الله جل جلالہ
خطباتِ فقیر
جلد سولہ
ولادت النبی ﷺ
عقل کا نور
سنت نبوی ﷺ بہترین طریقۂ زندگی
رسوخ فی العلم کیسے
ورع وتقویٰ
کامیابی کے پانچ اصول
دورنگی چھوڑ دے
درخت میں پوشیدہ اسرار
پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، مفکرِ اسلام
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ
مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ، فیصل آباد
+92-041-2618003

خطباتِ فقیر
جلد ۱۶

ازافادات

محبوب العلماء والصلحاء

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

مجددی مدظلہم

مرتب

مولانا محمد حنیف نقشبندی

ناشر

مکتبۃ الفقیر

223 سنت پورہ فیصل آباد

041-2618003

نام کتاب ـــــــــــ خطباتِ فقیر (جلد ۱۶)

از افادات ـــــــــــ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مرتب ـــــــــــ مولانا محمد حنیف نقشبندی

ناشر ـــــــــــ مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد

اشاعت اوّل ـــــــــــ جون 2009ء

اشاعت دوم ـــــــــــ نومبر 2009ء

اشاعت سوم ـــــــــــ مئی 2010ء

تعداد ـــــــــــ 1100

کمپیوٹر کمپوزنگ ـــــــــــ ڈاکٹر شاہد محمود عفی عنہ

فہرست

❁❁❁❁

عرضِ ناشر

محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کے علوم و معارف پر مبنی بیانات کو شائع کرنے کا یہ سلسلہ خطبات فقیر کے عنوان سے 1996ء بمطابق ۱۴۱۷ھ میں شروع کیا تھا اور اب یہ سولہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس طرح شاہین کی پرواز ہر آن بلند سے بلند تر اور فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے کچھ یہی حال حضرت دامت برکاتہم کے بیاناتِ حکمت و معرفت کا ہے۔ ان کے جس بیان کو بھی سنتے ہیں ایک نئی پروازِ فکر آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ خطابت یا یاد کی ہوئی تقریریں نہیں ہیں بلکہ حضرت کے دل کا سوز اور روح کا گداز ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر آپ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ بقول شاعر

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ خانہ

''خطباتِ فقیر'' کی اشاعت کا یہ کام ہم نے اسی نیت سے شروع کر رکھا ہے کہ حضرت اقدس دامت برکاتہم کی فکر سے سب کو فکر مند کیا جائے اور انہوں نے اپنے مشائخ سے علم و حکمت کے جو موتی اکٹھے کر کے ہم تک پہنچائے

ہیں، انہیں موتیوں کی مالا بنا کر عوام تک پہنچایا جائے۔ یہ ہمارے ادارے کا ایک مشن ہے جو ان شاء اللہ سلسلہ وار جاری رہے گا۔ قارئینِ کرام کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ اس مجموعہء خطبات کو ایک عام کتاب سمجھ کر نہ پڑھا جائے کیونکہ یہ بحرِ معرفت کے ایسے موتیوں کی مالا ہے جن کی قدر و قیمت اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ صاحبِ خطبات کی بے مثال فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت اور حلاوت وذکاوت کا فقید المثال اظہار ہے جس سے اہلِ ذوق حضرات کو محظوظ ہونے کا بہترین موقع ملتا ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی یا کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لئے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کیلئے یہ خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور اسے آخرت کے لئے صدقہء جاریہ بنائیں۔ آمین بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی عفی عنہ
خادم مکتبۃ الفقیر فیصل آباد

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

فقیر کو جب عاجز کے شیخ مرشد عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب نقشبندی مجددی نوراللہ مرقدہ نے اشاعت سلسلہ کے کام کی ذمہ داری سونپی تو ابتدا میں چند دن اپنی بے بضاعتی کے احساس کے تحت اس کام کے کرنے میں متذبذب رہا، لیکن حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے بھانپ لیا، چنانچہ فرمایا کہ بھئی تم نے اپنی طرف سے اس کام کو نہیں کرنا بلکہ اپنے بڑوں کا حکم پورا کرنا ہے، کیوں نہیں کرتے؟ مزید فرمایا کہ جب کبھی مجلس میں بیان کے لیے بیٹھو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جایا کرو، بڑوں کی نسبت تمہاری پشت پناہی کرے گی۔ چنانچہ حضرت کے حکم اور نصیحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بندہ نے وعظ و نصیحت اور بیانات کا سلسلہ شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوئی، حلقہ بڑھتا رہا اور الحمد للہ شرکا، کو کافی فائدہ بھی ہوتا کیونکہ ان کی زندگیوں میں تبدیلی عاجز خود بھی دیکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد چہار اطراف سے بیانات کے لیے دعوتیں آنے شروع ہو گئیں۔ شیخ کا حکم تھا، سرتابی کی مجال کہاں؟ جب بھی دعوت ملی رختِ سفر باندھا اور عازمِ سفر ہوئے۔ اس کثرت سے اسفار ہوئے کہ بعض اوقات صبح ایک ملک، دوپہر دوسرے ملک اور رات تیسرے ملک میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ملکوں کو محلّہ بنا دیا۔ اِس ناتواں میں یہ ہمت کہاں؟..... مگر وہ جس سے چاہیں کام لے لیتے ہیں۔ بقول شخصے

''قدم اٹھتے نہیں اٹھوائے جاتے ہیں''

حقیقت یہ ہے کہ یہ میرے شیخ کی دعا ہے اور اکابر کا فیض ہے جو کام کر رہا ہے،
و اما بنعمة ربك فحدث ۔

بیانات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے کچھ عرصے بعد جماعت کے کچھ دوستوں نے ان کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا، مکتبۃ الفقیر نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی، یوں خطبات فقیر کے عنوان سے نمبروار یہ ایک سلسلہ چل پڑا۔ یہ عاجز کئی ایسی جگہوں پر بھی گیا جہاں یہ خطبات پہلے پہنچے ہوئے تھے اور وہاں علما طلبا نے کافی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

ان خطبات کے مطالعے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ بیانات کا مجموعہ ہے، ان میں علمی غلطی یا بھول کا امکان موجود ہوتا ہے۔اس لیے معزز علمائے کرام سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ دعا ہے کہ جو حضرات بھی ان بیانات کی ترتیب و اشاعت میں کوشاں ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائیں اور انہیں اپنی رضا اپنی لقا اور اپنا مشاہدہ نصیب فرمائیں اور عاجز کو بھی مرتے دم تک اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔آمین ثم آمین

دعا گو و دعا جو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

كان الله له عوضا عن كل شيء

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى ۝ ﴾

ولادت النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی
دامت برکاتہم

اقتباس

بی بی آمنہ فرماتی ہیں کہ جب ولادت کا دن قریب آیا تو ایک سرخ ستارہ آسمان پر چمکنے لگا۔ تورات کے اندر یہ نشانی تھی کہ جب نبی آخرالزماں ﷺ پیدا ہونگے تو آسمان پر سرخ ستارہ چمکے گا۔ چنانچہ یہود ہمیشہ اس کو دیکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔ جب وہ ستارہ چمکا تو یہود میں غلغلہ مچ گیا اور ان کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ وہ انتہائی پریشان ہوئے کہ نبی آخرالزماں ﷺ تو پیدا ہونے والے ہیں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

ولادت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ ﴾
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

انعام سے پہلے آزمائش کا مرحلہ:

دوائیوں کی بوتلوں پر اکثر اوقات یہ بات لکھی ہوتی ہے۔

Shake well before use.

(استعمال سے پہلے اچھی طرح ہلائیں)

یہ بات اکثر ذہن میں آتی ہے کہ اللہ رب العزت اپنے بندے کو جب کوئی خاص نعمت دینا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے اس کو بھی جھنجھوڑتے ہیں، اسے اچھی طرح آزماتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اسے اس خاص نعمت سے نوازتے ہیں۔ اس کی دلیل قرآن مجید میں ہے۔

اللہ رب العزت نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو نعمتوں سے نوازنا تھا تو اس سے پہلے ان کو بھی آزمایا۔ ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمَاتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ﴾ (البقرۃ: ۱۲۴)

''اور یاد کرو اس وقت کو جب آزمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کچھ باتوں میں اور وہ اس میں سینٹ پرسینٹ (سو فیصد) کامیاب ہو گئے''

پھر کیا نتیجہ نکلا؟......فرمایا:

﴿ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ (ایضاً)

''فرمایا (اے میرے پیارے ابراہیم) میں آپ کو انسانوں کا امام بناتا ہوں''

تو امامت ملنے سے پہلے آزمائے گئے۔...... اللہ نے اپنے مقبول بندوں کو آزمایا۔ اتنی آزمائشیں آئیں کہ قرآن مجید نے گواہی دی:

﴿ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاءُ وَ الضَّرَّاءُ وَ زُلْزِلُوْا ﴾ (البقرۃ: ۲۱۴)

''ان پر اس قدر آزمائشیں آئیں، تنگی آئی، سختی آئی اور اس طرح ان کو جھنجھوڑا گیا''

﴿ حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ﴾

(البقرۃ: ۲۱۴)

''حتی کہ رسول اور ان کے ساتھ جو ایمان لائے وہ پکار اٹھے۔ اللہ کی مدد کب آئی گی؟''

جب اس نکتے پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾

''جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ رب العزت کے چنے ہوئے بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی آزمایا اور قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴾

''اور ان کو اچھی طرح جھنجھوڑا گیا''

اور بات بھی سچی ہے۔ کیونکہ ہم نے مٹی کا ایک برتن لینا ہوتا ہے تو اس کو بھی ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں کہ یہ کچا ہے یا پکا۔ اگر ہم دو روپے کے برتن کو کچا پکا دیکھتے ہیں اور تین روپے کے تربوز کو ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں کہ یہ کچا ہے یا پکا، تو اللہ رب العزت نے بھی انسان کو اپنا بنانا ہوتا ہے اس کو بھی ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں کہ یہ کچا ہے یا پکا۔ چنانچہ آزمایا جاتا ہے اور جو اس میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کو انعام ملتا ہے۔

تین عظیم شخصیات کی آزمائش:

سیدنا رسول اللہ ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قریش کے قبیلہ میں پیدا فرمانا تھا تو آپ ﷺ کی تین قریبی شخصیات کو مشقتوں میں ڈالا گیا۔

(۱) حضرت عبدالمطلب کی آزمائش:

ایک آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کو۔ انہیں آپ ﷺ کا دادا ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ عبدالمطلب بہت خوبصورت تھے۔ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے کچھ بال پیدائشی طور پر سفید تھے، اسی نسبت سے ان کا نام شیبہ رکھا گیا۔ اللہ کی شان کہ کچھ عرصے کے بعد ان کے والد وفات پا گئے۔ ان کی والدہ کا نام سلمیٰ تھا، وہ مدینہ منورہ آ گئیں۔ بچہ اپنی والدہ کے پاس پرورش پاتا رہا حتی کہ ابتدائی جوانی کی عمر کو پہنچا۔

مکہ مکرمہ کا رہنے والا ایک حارثی شخص کسی کام کے لیے مدینہ گیا تو اس نے چند لڑکوں کو تیر اندازی کا مقابلہ کرتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نوجوان جو دیکھنے میں بھی خوبصورت تھا اور جس کی شخصیت میں جاذبیت بھی تھی وہ جب بھی نشانہ لگاتا ٹھیک نشانہ پر تیر لگتا۔ پھر وہ خوشی سے اشعار پڑھتا: لوگو! میں مکہ کے رہنے والے قبیلہ قریش

کا فرزند ہوں، میرے نشانے ٹھیک لگتے ہیں۔ حارثی کو اس پر بڑا پیار آیا۔ چنانچہ اس نے پوچھا: یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ یہ مکہ میں پیدا ہوا تھا کچھ عرصہ بعد اس کا والد فوت ہو گیا اور یہ اپنی والدہ کے ساتھ یہاں اپنے ننھیال آیا ہوا ہے۔ وہ ان کے سارے قبیلے والوں کو جانتا تھا۔

واپسی پر اس نے آ کر ان کے چچا (جن کا نام مطلب تھا) سے کہا کہ تم اتنے مہمان نواز ہو، اتنے سخی اور اتنے اچھے اخلاق والے ہو، کیا تمہیں پتہ نہیں کہ تمہارا بھتیجا کتنی مشکل میں وقت گزار رہا ہے!؟ اسے اپنے پاس لاؤ اور اس کی اچھی تربیت کرو۔ اس شخص نے انہیں اتنا برانگیختہ کیا کہ اس نے قسم کھائی کہ جب تک میں اپنے بھتیجے کو مکہ نہیں لاؤں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ مطلب مدینہ آئے ان کی والدہ سے بات کی خاندان والوں نے بھی ماں کو سمجھایا کہ بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ اگر یہ تمہارے پاس رہے گا تو صحیح معنوں میں عزت کا مقام نہیں پا سکے گا اور اگر وہ اپنے ددھیال میں چلا جائے گا تو ان کا بڑا قبیلہ ہے اور وہ اشراف ہیں اس لیے وہاں اس کا نمایاں مقام ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے شیبہ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔

اب یہ خوبصورت نوجوان پیچھے بیٹھا ہے اور اس کے چچا آگے بیٹھے ہیں۔ جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور کسی بندے نے دیکھا تو وہ سمجھا کہ مطلب اپنے لیے غلام لائے ہیں، تو اس نے ان کو عبدالمطلب کہہ دیا۔ اس کے بعد یہ نام ایسا معروف ہوا کہ ان کو شیبہ کی بجائے عبدالمطلب کہا جانے لگا۔

اس نوجوان کو اللہ رب العزت نے یتیمی کے دن تو دکھائے مشقتوں کے دن تو دکھائے مگر ان کے بعد ان کو انعام ملنا تھا۔..... انعام کیا ملا؟...... ان کو خواب آیا کہ فلاں جگہ پر زم زم ہے اگر وہاں سے زمین کو کھودو تو بند چشمہ نکل آئے گا۔ ان دنوں مکہ مکرمہ میں پانی نہیں تھا، لوگوں کے لیے وہاں رہنا مشکل تھا، نہ جینے کو پانی نہ پینے کو

پانی۔ چنانچہ عبدالمطلب نے زمین کی کھدوائی شروع کر دی۔ وہ اکیلے ہی زمین کھودتے رہے، بالآخر وہ دن بھی آیا جب انہوں نے زم زم کے چشمے کے دہانے پر بڑی چٹان کو توڑا اور نیچے سے پانی نکل آیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عبدالمطلب کو بیت اللہ کا متولی بنا دیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیت اللہ کا متولی بنانا تھا اس لیے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو مشکل اور تنگی کے حالات دکھائے...... یہ تربیت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے۔

آج ہم لوگ اس بات کو سمجھ نہیں پاتے اگر کسی پر ذرا سی مشقت کے دن آنے لگیں تو وہ سمجھتا ہے کہ بس میں اللہ سے دور ہو گیا ہوں اور اللہ مجھ سے ناراض ہے۔ اس کو یہ کتنی بڑی غلط فہمی لگ جاتی ہے کہ پیسہ ملنے کو اللہ تعالیٰ کی خوشی سمجھتے ہیں اور پیسے کے کم ہونے کو اللہ کی ناراضگی سمجھتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی یا اس کے راضی ہونے کا تعلق احکام شریعت کے ساتھ ہے۔ اگر زندگی شریعت کے مطابق ہوگی اللہ رب العزت راضی ہوں گے اور اگر زندگی شریعت کے خلاف ہوگی تو کروڑوں پتی نہیں اربوں پتی ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہونگے۔ یہ کھلی ڈھلی بات ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ کی آزمائش:

عبدالمطلب نے منت مانی کہ اگر میرے دس بیٹے ہوئے تو میں ان میں سے ایک کو اللہ کے نام پر قربان کروں گا۔ اللہ کی شان کہ دس بیٹے بھی مل گئے۔ اب انہوں نے سوچا کہ میں اپنی قسم کو پورا کروں۔ لیکن بیٹوں میں سے کس کو ذبح کروں؟ اس کے لیے قرعہ ڈالا۔ قرعہ ان کے بیٹوں میں سے ایسے بیٹے کے نام آیا جو بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ لوگوں نے کہا: بھئی! بچے کو ذبح نہ کرو۔ بلکہ بچے اور اونٹوں کے درمیان تم قرعہ ڈال لو چنانچہ انہوں نے بچے کے نام اور دس اونٹوں

کے نام قرعہ ڈالا مگر قرعہ عبداللہ کے نام نکلا ...... پھر دس اونٹ اور بڑھا دیے، بیس اونٹ اور عبداللہ ...... قرعہ عبداللہ کے نام ...... پھر تیس اونٹ اور عبداللہ ...... قرعہ عبداللہ کے نام ...... اونٹ بڑھتے گئے، بڑھتے گئے، حتیٰ کہ جب سو اونٹوں کی تعداد رکھی گئی تو اب قرعہ اونٹوں کے نام آ نکلا۔ چنانچہ عبدالمطلب نے عبداللہ کے بدلے میں سو اونٹوں کو قربان کیا، اس لیے عبداللہ کو ذبیح اللہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کو ان کے والد نے اللہ کے نام پر ذبح کرنے کی نیت کی تھی۔

ایک مرتبہ ایک بدو آیا۔ اس نے نبی ﷺ سے کہا: **یا ابن ذبیحین** ...... تو نبی ﷺ مسکرائے اور فرمایا، ہاں! میں اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں اور وہ ذبیح اللہ تھے اور میں عبداللہ کا بیٹا ہوں اور عبداللہ بھی ذبیح اللہ تھے۔

حضرت عبداللہ جب جوان ہوئے تو ان کی جوانی اور خوبصورتی کو دیکھ کر لوگوں کو رشک آتا تھا۔ یہود بے بہبود نے اپنی کتابوں میں نشانیاں پائی تھیں۔ چنانچہ ان کو پتہ تھا جو شخص نبی آخرالزماں کا والد بنے گا، اس کی پیشانی پر نور چمکے گا۔ چنانچہ ان یہودیوں کی عورتیں بھی ایسے نوجوان کو تلاش کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ مکہ سے مدینہ جانے لگے۔ تو راستے میں ایک فاطمہ نامی عورت نے حضرت عبداللہ کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا۔ فرمایا: میں تو اس طرح نکاح نہیں کر سکتا، اس نے کہا: اگر نکاح نہیں کر سکتے تو ویسے ہی میرے ساتھ ملاقات کرلو۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جو انسان کے لیے ذلت اور رسوائی کا سبب بنے ...... اور واقعی جن پشتوں میں نبوت کا نور آگے منتقل ہوتا ہے وہ کبھی زنا جیسے جرم کا ارتکاب نہیں کیا کرتیں ...... چنانچہ حضرت عبداللہ مدینہ پہنچ گئے۔

مدینہ میں بنوزہرہ کے نام سے ایک قبیلہ تھا، ان کی ایک جوان العمر لڑکی تھی جس

کا نام آمنہ تھا۔ وہ بہت اچھے اخلاق والی، بہت ہی نیک تربیت والی اور نیک فطرت والی بچی تھی۔ شکل بھی تھی، عقل بھی تھی، نیک بھی تھی، اور ہر نعمت اس کے پاس تھی۔ چنانچہ اسے حضرت عبداللہ کے لیے پسند کیا گیا اور پھر اس کے ساتھ ان کا نکاح ہوا۔

نکاح کے بعد جب حضرت عبداللہ واپس آئے تو یہی فاطمہ نامی عورت نے پھر حضرت عبداللہ کو دیکھ کر کہنے لگی: اب آپ کے چہرے پر وہ نور نظر نہیں آ رہا جو مجھے پہلے نظر آتا تھا۔ حقیقت میں نبی ء رحمت ﷺ اپنے والد سے اپنی والدہ کے بطن میں منتقل ہو چکے تھے...... اب دیکھیے! کہ عبدالمطلب پر بھی امتحان آیا، پھر حضرت عبداللہ پر بھی امتحان آیا۔ اب تیسری شخصیت بی بی آمنہ کی تھی جس نے والدہ بننا تھا ان پر بھی امتحان آیا۔

(۳) بی بی آمنہ کی آزمائش:

شادی کے چند مہینوں کے بعد مکہ مکرمہ کا ایک قافلہ تجارت کے لیے بلد شام کی طرف گیا، حضرت عبداللہ بھی اس قافلے کے ساتھ گئے۔ اب شادی کے ابتدائی دنوں میں میاں بیوی میں جدائی دل کو بڑا اداس کرتی ہے۔ تو بی بی آمنہ بھی بہت اداس ہوئیں۔ حضرت عبداللہ نے وعدہ کیا کہ اداس نہ ہو، میں جلدی آ جاؤں گا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ جب قافلے کے آنے کی گھنٹی بجے تو اس وقت تم دروازے پر آنا، میرا استقبال کرنا، میں بھی تمہیں محبت سے ملوں گا۔ یہ وعدہ کر کے حضرت عبداللہ چلے گئے۔

کچھ وقت بلادِ شام میں تجارت کے لیے گزارا، جب وہاں سے واپس تشریف لانے لگے تو مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ کو بخار ہو گیا۔ اور ایسے بیمار ہوئے کہ ان کے لیے سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مدینہ میں سسرال کے ہاں قیام کر لیا۔

جب وہ قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا اور گھنٹی بجی تو بی بی آمنہ بہت خوش ہوئیں کہ میرے

شوہر آ گئے۔ چنانچہ دروازے پر آئیں، قافلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مگر حضرت عبداللہ نہ آئے۔ بی بی آمنہ اور زیادہ پریشان ہوئیں، پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور مدینہ طیبہ میں ہیں۔ لہٰذا ان کے قریبی رشتہ دار مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اللہ کی شان کہ رشتہ دار ابھی مدینہ پہنچے بھی نہیں تھے کہ حضرت عبداللہ اٹھارہ سال کی جوانی کی عمر میں اللہ کے پاس چلے گئے۔ بی بی آمنہ کی عمر تو اٹھارہ سال سے بھی کم ہوگی، اتنی چھوٹی عمر میں بی بی آمنہ بیوہ ہوگئیں۔ اب سوچیے کہ بی بی آمنہ پر کیا بیتی ہوگی۔

احوال عجیبہ کا ظہور:

بی بی آمنہ فرماتی ہیں کہ مجھے بہت دیر کے بعد پتہ چلا کہ میں حاملہ ہوں۔ مگر یہ حمل عجیب تھا کہ بچے ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں تو اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ مجھے تکلیف ہی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ البتہ مجھے حالات کچھ بدلے بدلے نظر آتے تھے...... وہ کیسے؟

☆...... جب میں کہیں جانے لگتی تو میں دیکھتی کہ ایک جھونکا آتا ہے اور درخت میرے آگے جھک جاتے۔ اس طرح میں اپنے سامنے درختوں کو جھکتا دیکھتی تھی۔

☆...... جب میں پانی بھرنے کے لیے زم زم کے چشمے پر پہنچتی تو دیکھتی کہ زم زم کا پانی اوپر کنارے کے بالکل قریب ہوتا تھا اور جب میں پانی بھر کر واپس آنے لگتی تو پانی نیچے چلا جاتا۔ مکہ کی عورتیں مجھے وہاں پکڑ کر کھڑا کر دیتیں اور کہتیں: ''آمنہ! تم نے نہیں جانا، تم کھڑی رہو، تمہاری وجہ سے ہمیں زم زم آسانی سے ملتا ہے''۔

☆...... میں یہ بھی دیکھتی کہ اگر مجھے دھوپ میں کوئی کام کرنا ہوتا تو بادل کا ٹکڑا آکر میرے اوپر سایہ کر دیتا تھا یہ درختوں کا جھک جانا، پانی کا قریب آجانا اور بادل کا سایہ کرنا ایسی باتیں تھی جو مجھے انوکھی لگتی تھیں۔ اسی دوران بی بی آمنہ نے خواب

دیکھا اس خواب کی تعبیر یہ تھی کہ تم ایک بہت بڑی مقدس ہستی کی والدہ بننے والی ہو۔

یہودیوں کا اضطراب:

بی بی آمنہ فرماتی ہیں کہ جب ولادت کا دن قریب آیا تو ایک سرخ ستارہ آسمان پر چمکنے لگا۔ تورات کے اندر یہ نشانی تھی کہ جب نبی آخرالزماں ﷺ پیدا ہونگے تو آسمان پر سرخ ستارہ چمکے گا۔ چنانچہ یہود ہمیشہ اس کو دیکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔ جب وہ ستارہ چمکا تو یہود میں غلغلہ مچ گیا اور ان کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ وہ انتہائی پریشان ہوئے کہ نبی آخرالزماں ﷺ تو پیدا ہونے والے ہیں۔ چنانچہ وہ یہود کی عورتوں میں سے معلوم کرتے کہ کونسی ایسی عورت ہے جو حاملہ ہے اور اس کے وضع حمل کی مدت قریب ہے مگر انہیں کوئی ایسی عورت نظر نہ آئی۔

بالآخر ایک یہودی مکہ مکرمہ آیا، جب اس نے قریش کے خاندان سے پتہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ بی بی آمنہ کے ہاں ولادت کا وقت قریب ہے چنانچہ اس نے شور مچایا، ''لوگو! مجھے لگتا ہے کہ نبوت بنو اسحاق سے تبدیل ہو کر بنو اسماعیل میں آ گئی ہے۔ ہم سے یہ نعمت چلی گئی ہے''

خصائصِ ولادت:

اللہ کی شان کہ جس رات نبی ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی، بی بی آمنہ فرماتی ہیں کہ ہمارے گھر میں جلانے کے لیے چراغ کے اندر تیل بھی نہیں تھا۔ لیکن جب نبی ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی تو کچھ عجیب سے واقعات رونما ہوئے۔ مثال کے طور پر:

◉...... جب نبی اکرم ﷺ کو ولادت کے بعد میں لٹانے لگی تو آپ ﷺ نے اس وقت اللہ رب العزت کے حضور سجدہ کیا۔ ایسے ہو گئے جیسے سجدہ کر رہے ہیں۔

⊙ ......آسمان کے ستارے جھک گئے جیسے قریب آ رہے ہیں۔

⊙ ......کسریٰ بادشاہ کے محل کے چودہ کنگرے گر گئے۔

⊙ ......فارس کے اندر آتش پرستوں کی ایک آگ تھی جو ڈیڑھ ہزار سال سے جل رہی تھی۔کبھی بجھی نہیں تھی وہ اچانک بجھ گئی۔

کسریٰ کا خواب اور اس کی تعبیر:

اس دوران کسریٰ نے خواب دیکھا کہ عربی اونٹ ہیں اور ان کے آگے کچھ گھوڑے ہیں اور وہ عربی اونٹ ان گھوڑوں کو دھکیل کر دریا سے پار بھگا رہے ہیں۔ اس نے تعبیر کرنے والے کو بلایا۔تعبیر کرنے والے نے بتایا کہ مجھے لگتا ہے کہ عرب میں کوئی ایسی شخصیت پیدا ہوگی کہ جس کی وجہ سے عرب کے لوگ باقی لوگوں کو جزیرۂ عرب سے باہر نکال دیں گے۔

چودہ بادشاہتوں کے خاتمے کا اشارہ:

اس نے کہا: میرے محل کے چودہ کنگرے گرے ہیں، اس نے تعبیر دی: جناب! آپ سے لیکر چودہ بادشاہتیں آپ کے خاندان میں رہیں گی اور اس کے بعد یہ بادشاہت ان کے پاس چلی جائے گی۔کسریٰ مطمئن ہوگیا کہ چودہ بادشاہتیں تو ختم ہونے میں بڑا وقت لگے گا مگر اس کو پتہ نہیں تھا کہ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے عرصے میں جو بھی بادشاہ بنتا رہا وہ مرتا رہا۔ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وہ چودہ بادشاہتیں مکمل ہوگئیں۔اور اللہ نے کسریٰ کا وہ تخت و تاج مسلمانوں کو عطا فرما دیا۔

ستارے جھکنے میں اسرار:

ستارے جھکے......اس میں کیا حکمت تھی؟......بتانا یہ مقصود تھا کہ!

⊙ ......لوگو! یہ وہ شخصیت ہے جس کے سامنے آسمان کی مخلوق بھی جھک رہی ہے۔دنیا

والو! تم بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو گے تب فلاح پاؤ گے۔

◉ ......وقت کے بادشاہوں کو پیغام تھا کہ دیکھو! آسمان پر چمکنے والے ستارے بھی اگر جھک گئے ہیں تو تم زمین پر چمکنے والے لوگ ہو تمہیں بھی ان کے سامنے گردنوں کو جھکانا پڑے گا۔

◉ ......اور ایک نکتہ اس میں یہ تھا کہ یہ پیدا ہونے والی ایسی ہستی ہے کہ ان کی صحبت میں جو آئے گا، ان کے قدموں میں جو آئے گا، ان کی تعلیمات کو جو اپنائے گا، جس طرح آسمان کے ستارے ہیں اسی طرح ان کی صحبت میں آنے والے زمین کے ستارے بن جائیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اُقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ

''میرے صحابہ ستاروں کی مثل ہیں ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پا جاؤ گے''

ایک صاحبِ دل کا عاشقانہ کلام:

نبی ﷺ کی ولادتِ مبارکہ کے بارے میں کسی صاحبِ دل بندے نے کیا ہی اچھی بات کہی، فرماتے ہیں:

خلیل اللہ نے جس کے لیے حق سے دعائیں کیں
ذبیح اللہ نے ہونے ذبح جس کی التجائیں کیں
جو بن کے روشنی پھر دیدۂ یعقوب میں آیا
جسے یوسف نے اپنے حسن کے نئے رنگ میں پایا
کلیم اللہ کا دین روشن ہوا جس ضو فشانی سے
وہ جس کی آرزو بھڑکی جوابِ لن ترانی سے

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یتیم پیدا ہونے سے یہ بتانا مقصود تھا کہ دیکھو! ظاہراً

یہ ہستی بے سہارا ہے، مگر جس کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا، اس کا سہارا اللہ ہوتا ہے۔

والد کو ابا بھی کہتے ہیں، عربی میں ابو بھی کہتے ہیں...... **وکان ابوهما صالحا** ...... ابو کو مخفف کر کے اب بھی کہہ دیتے ہیں۔ تو اب ذرا غور کیجیے؟ اللہ تعالیٰ نے یتیم پیدا کر کے یہ پیغام دیا کہ لوگو! جس کا دنیا میں اب نہیں ہوتا اس کا رب ہوتا ہے اور جس کا رب ہوتا ہے اس کا سب ہوتا ہے۔

اُمّی و دقیقہ دانِ عالم
بے سایہ و سائبان عالم

یتیم ایسے ہی دُرِ یتیم بنتے ہیں...... اللہ اکبر:

وہ جس کے نام سے داؤد نے نغمہ سرائی کی
وہ جس کی یاد میں شاہ سلیماں نے گدائی کی
دلِ یحییٰ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے
لب عیسیٰ پہ آئے وعظ جس کی شان رحمت کے
وہ دن آیا کہ پورے ہو گئے تورات کے وعدے
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے
جناب رحمۃ للعالمین تشریف لے آئے

یتیم دُرِّ یتیم بن گئے:

اللہ کی شان دیکھیے کہ آپ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ سے تین ماہ پہلے آپ ﷺ کے والد ماجد کی وفات ہو گئی، جس کی وجہ سے آپ یتیم پیدا ہوئے ...... یتیم اسے کہتے ہیں جس کے والد کی وفات اس کے بالغ ہونے سے پہلے ہو جائے، بلوغ کی عمر کے بعد کوئی یتیم نہیں رہتا۔ چاہے ولادت سے پہلے فوت ہو جائیں چاہے بلوغ سے پہلے فوت ہو جائیں ...... تو نبی علیہ الصلوٰۃ السلام جب دنیا میں تشریف لائے اس وقت

والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔

ولادت کے بعد آپ ﷺ کے دادا آپ ﷺ کو بیت اللہ کی طرف لے کر گئے ۔مگر دادا کو معلوم نہیں تھا کہ یہ وہ شخصیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں گی ۔

قدم قدم پہ رحمتیں قدم قدم پہ برکتیں
جہاں جہاں سے وہ شفیع عاصیاں گزر گیا

جب ساتواں دن آیا تو.......:

جس نے بھی بچے کو دیکھا، اس نے اسے بہت پیار کیا اور تعریف کی، چنانچہ جب ساتویں دن نام رکھنے کا وقت آیا تو عبدالمطلب نے کہا کہ میرے اس بیٹے کی ہر بندے نے تعریف کی ہے لہٰذا میں اس کا نام ''محمد'' رکھوں گا...... محمد کا مطلب ہے وہ ذات جس کی کائنات میں سب سے زیادہ تعریفیں کی گئی ہوں...... نبی ﷺ محمد بھی تھے اور احمد بھی تھے...... احمد کا مطلب ہے وہ ذات جو اللہ کی اتنی تعریفیں کرے کہ اللہ کی اتنی تعریف کسی اور نے نہ کی ہوں...... یہ دونوں نام اس سے پہلے کبھی نہیں رکھے گئے تھے۔ سبحان اللہ! اتنا خوبصورت نام رکھا گیا!

بچے کو گود میں لینے کے لیے عورتوں کی آمد:

جب نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی ولادت مبارکہ ہوئی، اس وقت طائف کے قریب ایک گاؤں میں بنوسعد قبیلہ رہتا تھا اس قبیلے کی دس عورتیں مکہ مکرمہ کی طرف چلیں تاکہ وہ اپنی اپنی گود میں بچہ لیکر آئیں، بچے کو پالیں گی اور اس کے والد سے انعام کی مستحق بنیں گی۔ان دس عورتوں میں سے ایک عورت کا نام حلیمہ سعدیہ تھا۔ان کے پاس ایک اونٹنی تھی اور ایک گدھی تھی، گدھی کے اوپر سامانِ سفر تھا اور اونٹنی کے اوپر

حلیمہ اوراس کے خاوند تھے۔حلیمہ کے پاس دودھ پینے والا ایک اور بچہ بھی تھا۔ان کی اونٹنی بہت ہی لاغراور کمزورتھی جب دس عورتیں چلیں تو نوعورتیں آگے نکل گئیں اور حلیمہ پیچھے رہ گئیں۔دوتین مرتبہ توان عورتوں نے رک کرحلیمہ کے آنے کا انتظار کیا بعد میں انہوں نے کہاتمہاری وجہ سےتو سفر میں بہت دیر ہورہی ہے۔ہماراتو ساراسفر کھوٹا ہوگا۔اس لیے ہم تو چلتی ہیں چنانچہ نوعورتیں آگے چلیں اور حلیمہ سعدیہ سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ گئیں۔

ان میں سے ہرعورت چاہتی تھی کہ میں امیر باپ کے بیٹے کواپنی گود میں لوں تاکہ مجھے میری محنت کازیادہ پھل ملے۔چنانچہ سب عورتوں نے امیرلوگوں کے بیٹوں کوگود میں لے لیا۔عورتیں آتیں اور نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے والد کے بارے میں پوچھتیں کہ اس کے والد کہاں ہیں؟ جب پتہ چلتا کہ وہ توفوت ہوچکے ہیں اور یہ بچہ یتیم ہےتو وہ سوچتیں کہ پھر ہمیں تو کچھ نہیں ملے گا۔چنانچہ وہ واپس چلی جاتیں۔جب آنے والی عورت واپس چلی جاتی تو وہ بی بی آمنہ کے دل پرایک زخم لگا جاتی، بی بی آمنہ کاغم بڑھ جاتا، انہیں حضرت عبداللہ کی یادآجاتی۔اداس اورغمگین تو پہلے ہی تھیں اوراداس بندے کوایک لفظ ہی سننا پڑےتو وہ پھوٹ پڑتا ہے۔توان عورتوں کا آنا اور نبی علیہ الصلوۃ والسلام کوچھوڑ کرویسے ہی چلے جانا بی بی آمنہ کے دل پرایک بھاری ضرب لگاتا۔وہ سوچتی ہوں گی، کاش! آج عبداللہ ہوتے وہ اس کے لیے اچھا لباس لاتے، کھلونے لاتے اوراس کوسیر پر لے کر جاتے۔

بی بی آمنہ اپنےغم میں یہ باتیں سوچ رہی تھیں اوران کوکیا پتہ تھا کہ یہ وہ ہستی ہے کہ......

⊙ ......جن کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان کے چاندکوکھلونا بنادیں گے۔

⊙ ......جن کوسیر کروانے کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں عرش پر بلالیں گے۔

⊙......جن کو اللہ رب العزت دنیا کے اندر بھی شاہی عطا فرما دیں گے۔

پرورش کے لیے حلیمہ کے انتخاب میں راز:

جب حلیمہ مکہ مکرمہ میں آئیں تو انہیں اور تو کوئی بچہ نہ ملا۔ پتہ چلا کہ صرف ایک بچہ ہے جو باقی رہ گیا ہے......واہ میرے مولا! جس نے ایک کی عبادت کرنی تھی وہ ایک ہی رہ گیا۔ جس نے ایک قرآن کی طرف بلانا تھا وہ ایک ہی رہ گیا۔ جس نے ایک شریعت کی طرف بلانا تھا، وہ ایک اللہ کو ماننے والا، ایک ہی رہ گیا......اب بی بی حلیمہ کے پاس کوئی آپشن ہی نہ تھا۔

اس کے دل میں یہ بات آئی کہ میں دیکھوں تو سہی کہ یہ بچہ کیسا ہے؟ چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام سوئے ہوئے تھے اور اوپر چادر اوڑھائی گئی تھی۔ بی بی حلیمہ نے جیسے ہی چادر اتاری تو بچے نے آنکھیں کھول لیں۔ اور وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا......اس کی مسکراہٹ میں ایسی جاذبیت تھی، ایسی کشش تھی، ایسا انجذاب تھا کہ بی بی حلیمہ اپنا دل ہی دے بیٹھی...... چنانچہ وہ اپنے خاوند سے پوچھنے لگی، اگرچہ ہمیں اس بچے کا انعام زیادہ تو نہیں ملے گا کیوں کہ یہ یتیم ہے۔ مگر اس بچے کی مسکراہٹیں میرے دل کو تو تسلی دے دیا کریں گی۔ ان کے خاوند نے ان کو یہ مشورہ دیا: ہاں بے شک تم اس بچے کو لے لو پھر یہ بھی کہا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ لَنَا فِيْهِ بَرَكَةً

''ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اس میں برکت عطا فرمائے''

ان یہاں علما نے ایک نکتہ لکھا۔ دس عورتوں میں سے نو آئیں ان کی نظر اسباب پر تھی، ان کی نظر لوگوں پر تھی۔ کہ ان کے والدین ہمیں انعام دیں گے۔ ایک حلیمہ ہی ایسی ہی تھیں جس کے خاوند کی نظر اللہ کی بھیجی ہوئی برکت پر تھی، کیونکہ اس نے کہا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ لَنَا فِيْهِ بَرَكَةً

''ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اس میں برکت عطا فرمائے''

انہوں نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حلیمہ کا انتخاب اس لیے کیا کہ

(۱) ایک تو وہ حلم والی تھیں ان کی طبیعت میں حلم تھا۔کئی دفعہ ماں کی طبیعت میں حلم نہیں ہوتا تو وہ بچے کی ذراسی بات پر غصے میں آکر تھپڑ لگا دیتی ہے۔وہ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگ جاتی ہے اور یہ تو اللہ کے محبوب ﷺ کی پرورش ہونی تھی۔لہٰذا اللہ رب العزت نے ایسی عورت کو پسند کیا جس کا ظرف بڑا تھا،جس کا حوصلہ بڑا تھا۔جلدی غصے میں نہیں آتی تھیں،وہ حلم والی تھی جس کی وجہ سے اس کا نام ہی حلیمہ پڑ تھا تھا۔

(۲) اور دوسری بات یہ کہ اس کی نظر مخلوق پر نہیں تھی بلکہ اس کی نظر اللہ رب العزت کی ذات پر تھی۔

''لوگو!اس میں ہمارے لیے ایک بڑا سبق ہے۔جو مخلوق کی جیب پر نظر رکھتا ہے وہ عام بچوں کو لے کر گھر آتا ہے اور جو اللہ رب العزت کی ذات پر نظر رکھتا ہے وہ حسنِ بے مثال کو لے کر اپنے گھر واپس آتا ہے۔

رب نے بنایا جب اس کو خود آپ کہا: سبحان اللہ!:

حلیمہ سعدیہ نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔حلیمہ اتنی خوش ہوئی کہ میں نے تو اتنا خوبصورت بچہ کبھی نہیں دیکھا۔وہ بار بار اس کی تعریف کرنے لگتیں کہ میں نے تو اتنا خوبصورت بچہ کبھی نہیں دیکھا۔بی بی آمنہ نے جواب دیا: حلیمہ!تم گاؤں کی رہنے والی ہو،تم نے کیا بچے دیکھے ہوں گے،میں مدینہ میں بھی رہی اور مکہ میں بھی رہی،میں شہروں کی رہنے والی ہوں،میں نے ایسا خوبصورت بچہ کبھی نہیں دیکھا۔عبدالمطلب پاس کھڑے تھے وہ کہنے لگے: تم شہروں کی بات کرتی ہو میں ملکوں میں ہو کے آیا ہوں۔بلادِ شام کا سفر کر کے آیا ہوں میں نے ملکوں میں ایسا بچہ نہیں دیکھا۔

حلیمہ کہتی ہیں کہ میں نے گاؤں میں ایسا بچہ نہیں دیکھا۔ بی بی آمنہ فرماتی ہیں کہ میں نے شہروں میں ایسا بچہ نہیں دیکھا۔عبدالمطلب فرماتے ہیں کہ میں نے ملکوں میں ایسا بچہ نہ دیکھا۔ اور اگر میں چشمِ تخیل سے دیکھوں کہ اگر جبرائیل امین علیہ السلام پاس ہوتے تو جواب میں کہتے: حلیمہ تم نے گاؤں میں ایسا بچہ نہیں دیکھا...... بی بی آمنہ! تم نے شہروں میں نہ دیکھا...... عبدالمطلب تم نے ملکوں میں نہ دیکھا، اور میں نے پوری کائنات میں کہیں کوئی ایسا چہرہ نہیں دیکھا ۔

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتانِ آزری
ہر چند آفاق ہا بسیار خوباں دیدہ ام

اگر جبرائیل علیہ السلام یہ کہتے ،تو میرا تصور بھی یوں کہتا ہے: حلیمہ تو نے کہا میں نے گاؤں میں نہ دیکھا، بی بی آمنہ نے فرمایا میں نے شہروں میں نہ دیکھا، عبالمطلب نے فرمایا: میں نے لکھوں میں نہ دیکھا اور جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: میں نے پوری کائنات میں نہ دیکھا تو اللہ رب العزت اس وقت یوں فرماتے ہیں میں خود مخلوق کو پیدا کرنے والا ہوں، میں نے پوری مخلوق میں کوئی ایسا چہرا نہیں دیکھا۔

واللیل سیاہی زلفوں کی چہرہ والضحیٰ اس کا
سارے جہاں کے پیارا ہے آپ محبّ ہے خدا اس کا
رب نے بنایا جب اس کو خود آپ کہا سبحان اللہ

نبی علیہ الصلوۃ والسلام کبھی پنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے حبیب!

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ

آپ آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور ہم آپ کے محبوب چہرے کی طرف دیکھتے تھے۔

ماں کی دعاؤں کے ثمرات:

جب بچہ ماں سے رخصت ہونے لگتا ہے تو وہ اسے دعائیں دیتی ہے، ماں کے دل پر بچے کی جدائی کی خاص کیفیت ہوتی ہے۔ چنانچہ بی بی آمنہ کے دل سے دعائیں نکلیں۔ یہ ماں کی دعائیں بڑی نعمت ہوتی ہیں۔ آیئے! تاریخ پر نظر ڈالیے پہلے بھی ایسا ہوا کہ ماؤں نے اپنے بچوں کو دعاؤں سے رخصت کیا.....نتیجہ کیا نکلا؟ .....ذرا قرآن سے پوچھیے!

بی بی ہاجرہ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بچے کو تیار کر دو، کسی بڑے سے ملنا ہے۔ بی بی ہاجرہ بچے کو نہلاتی ہیں کپڑے پہناتی ہیں اور اپنے خاوند کے ساتھ ان کو روانہ کرتی ہیں، ماں دعاؤں سے روانہ کر رہی ہے۔ جب بچہ چلا تو اسمٰعیل تھا۔ اور جب لوٹ کر واپس آیا تو ذبیح اللہ بن چکا تھا یہ ماں کی دعائیں ہوتی ہیں۔

☆.....سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اپنے بچے کو ایک چھوٹے سے بکسے میں ڈال کر پانی میں بہا دیتی ہیں۔ ماں کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ ماں کتنی دعائیں دے رہی ہو گی!! لیکن ماں نہیں جانتی یہ میرا بیٹا آج مجھ سے رخصت ہو رہا ہے تو یہ موسیٰ ہے اور جب لوٹ کر آئے گا تو اللہ وہ مقام دے گا کہ یہ کلیم اللہ بن چکا ہوگا۔

☆.....عبدالمطلب جب اپنی ماں سلمٰی کے پاس رہتے تھے تو اس وقت ان کا نام شیبہ تھا، جب ان کے چچا لینے گئے تو سلمٰی نے رو کر اور دعائیں دے کر اپنے بیٹے کو رخصت کیا۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ جب بیٹا ماں کے پاس سے چلا تو شیبہ تھا اور جب مکہ مکرمہ پہنچا تو اللہ نے وہ مقام دیا کہ یہ والی بیت اللہ بن گیا۔

اب ذرا غور کیجیے کہ ایک بچہ ماں کے پاس سے چلتا ہے تو اسمٰعیل ہوتا ہے اور واپس آتا ہے تو ذبیح اللہ بن چکا ہوتا ہے۔ ایک بچہ ماں کی دعاؤں سے چلتا ہے تو موسیٰ ہوتا ہے، واپس آتا ہے تو کلیم اللہ کا رتبہ مل چکا ہوتا ہے۔ ایک بچہ چلتا ہے تو شیبہ نام

ہوتا ہے اور جب مکہ پہنچتا ہے تو والی بیت اللہ بن جاتا ہے۔ آج بی بی آمنہ اپنے بچے کو دعاؤں سے رخصت کر رہی ہے۔ نہیں جانتی تھیں کہ آج یہ بیٹا محمد ہے، جب لوٹ کے آئے گا تو اللہ وہ مقام دیں گے کہ محمد رسول اللہ بن جائے گا۔

عزیز طلبا! ماں کی دعاؤں سے اپنے آپ کو محروم نہ کیا کرو۔ کچھ نوجوان ضد کرتے ہیں۔ بے جا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ماں کا دل دکھاتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے انعام سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ماں کی دعائیں لے کر چلو پھر دیکھو کہ اللہ رب العزت کی کیا رحمتیں ملتی ہیں۔ کیا برکتیں ملتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا مقامِ صدارت:

بہر حال بی بی آمنہ نے اپنے فرزند ارجمند کو رخصت کیا اور حلیمہ ان کو لے کر واپس ہونے لگیں۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ جب اونٹنی پر سوار ہونے لگے تو حلیمہ کے خاوند نے ان کو پہلے بٹھا دیا اور بعد میں پھر آگے خود سوار ہوا کہ میں اونٹنی کو چلاؤں جب وہ خود سوار ہوا تو اونٹنی نہ چلی۔ حیران ہو کر نیچے اترا جیسے ہی وہ نیچے اترا اونٹنی چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ پھر آگے بیٹھا تو اونٹنی پھر نہیں چلتی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اصل مسئلہ کیا ہے اس نے کہا کہ حلیمہ! تم آگے بیٹھو میں پیچھے بیٹھتا ہوں۔ حلیمہ اس پیارے بچے کو سینے سے لگا کر آگے بیٹھ گئی اور اس کا خاوند پیچھے بیٹھا۔ سواری اس وقت چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ سواری نے سمجھا دیا:

''اے حلیمہ کے خاوند! یہ وہ مقدس ہستی ہے کہ اگر تم اسے اپنی پشت کی طرف بٹھاؤ گے تو میں کبھی تمہیں لے کر نہیں جاؤں گی، میرے قدم پہ چلنا حرام ہے۔ اگر چلانا چاہتے ہو تو یہ کائنات کا صدر نشیں ہے اس کو آگے صدر مقام پر بٹھاؤ''

چنانچہ اونٹنی نے بھاگنا شروع کر دیا، اللہ کی شان کہ اونٹنی ایسی تیز رفتاری سے

ساتھ بھاگی کہ حلیمہ ان عورتوں سے جاملیں جو بہت پہلے سے اپنا سفر شروع کر چکی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ حلیمہ کی سواری تو قدم آگے بڑھا رہی ہے۔ حیران ہو کر پوچھتی ہیں:...... حلیمہ! تم نے سواری بدل لی ہے؟...... حلیمہ نے جواب دیا۔

''میں نے سواری تو نہیں بدلی'' البتہ سواری کا سوار بدل گیا ہے۔''

دن بدل گئے:

حلیمہ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے سینے میں دودھ محسوس کیا، جبکہ کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے خاوند نے جو کہا تھا...... **عسی الله ان یجعل لنا فیه برکة**...... مجھے وہ برکت نظر آنے لگی۔ فرماتی ہیں کہ جب ہم گھر پہنچے تو دیکھا کہ بکریوں کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ گھر میں جتنے برتن تھے وہ سب انہوں نے دودھ سے بھر لیے۔ حلیمہ سعدیہ نے یہ کہا کہ اس بچے کی وجہ سے آج ہمارے دن بدل گئے، آج ہمارے گھر کے اندر برکتیں آگئیں، شاہی محل میں کیوں نہ پالا؟

طالب علم کے ذہن میں ایک نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے بعض انبیائے کرام کو شاہی محلات میں پالا ذرا غور کیجیے!

☆...... حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں پلے جب فرعون کی بیوی نے ان کو دیکھا تو کہنے لگی:

﴿ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰى اَنْ يَّنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ﴾

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شاہی محل میں پل رہے ہیں۔

☆...... حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو۔ عزیز مصر نے خریدا اور اپنی بیوی سے کہا:

﴿ عَسٰى اَنْ يَّنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ﴾

چنانچہ وہ بھی محل میں پلے...... تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض انبیائے کرام کو محلات

میں پالا لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حلیمہ کے غربت کدے میں پالا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر محل کی آسائشیں ہوتی تو نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی وجہ سے جو برکتیں آتیں لوگوں کو سمجھنے میں مشکل ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غربت کدے میں بھیجا...... بکریوں کے تھنوں میں دودھ نہیں ...... ماں کی چھاتی میں دودھ نہیں ...... پریشان حال ہیں ......اب اگر نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی تشریف آوری سے حالات بدلے تو دنیا نے تسلیم کر لیا کہ دیکھو! جو لکھ بھی نہیں رکھتے تھے، آج اللہ نے ان کو لاکھوں والا بنا دیا......اب یہ برکتیں کس وجہ سے ہیں؟...... یہ اس بچے کی وجہ سے ہیں۔ حتیٰ کہ حلیمہ کے خاوند نے ان سے کہا: حلیمہ!

لَقَدْ اَخَذْتِ مُبَارَكَةً

''یقیناً تو کوئی مبارک بچہ لے کر آئی ہے''

نبیِ رحمت ﷺ کی حلیمہ سعدیہ کے غربت کدے میں تشریف آوری کی وجہ سے اتنی برکتیں ظاہر ہوئیں کہ قریب کی عورتیں آتی اور کہتیں حلیمہ! تم اپنی بکریاں کہاں چراتی ہو؟ وہ کہتی فلاں پہاڑی پر تو وہ عورتیں بھی اپنی بکریاں وہاں بھیجتیں لیکن ان کی بکریوں میں پھر بھی اتنا دودھ پیدا نہ ہوتا جو حلیمہ کی بکریوں میں پیدا ہوتا تھا۔ دودھ اتنا زیادہ تھا!!

دوسرے پستان سے دودھ نہ پینے کی وجہ:

حلیمہ نے ایک عجیب بات دیکھی وہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو اپنے دائیں پستان سے دودھ پلاتی تھیں ایک مرتبہ ان کا جی چاہا کہ میں دوسری طرف سے بھی دودھ پلاؤں مگر بچہ دودھ ہی نہیں پیتا تھا۔ حلیمہ نے اس چیز کو نوٹ کیا کہ یہ بچہ ایک پستان سے دودھ پیتا ہے......اس میں کیا حکمت تھی؟...... حکمت یہ تھی کہ اگر بالفرض آپ

ﷺ دوسرے پستان سے بھی دودھ پی لیتے تو بعد میں آنے والی دنیا کہتی کہ خود تو بچپن میں بھائی کے حق کا دودھ پیتے رہے اور آج دنیا کو عدل وانصاف کا درس دینے کے لیے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو نبوت کا فطری مزاج لیکر دنیا میں آتے ہیں۔ بچپن میں ہی اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو وہ فطرت سلیمہ دے دی تھی کہ اپنے بھائی کے حق کی طرف منہ ہی نہیں کیا کرتے تھے...... اللہ اکبر کبیرا!!

حسن و جمال میں کشش اور جاذبیت:

حلیمہ کی بیٹی کا نام شیما تھا۔ ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ حلیمہ نے بیٹی سے کہا: شیما! دیر ہو رہی ہے بکریوں کو چرانے کے لیے لے کر جاؤ۔ شیما کہنے لگی: امی! بکریاں زیادہ ہیں میں اکیلی ہوں۔ میں ان کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک جاتی ہوں۔ مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی، کسی اور کو میرے ساتھ بھیجو تب میں جاؤں گی۔ حلیمہ نے کہا: بیٹی! گھر میں تو کوئی اور ہے نہیں، تیرا باپ بھی بوڑھا ہے اور میں بھی بوڑھی ہوں۔ لہٰذا اب تیرے ساتھ اور تو کوئی نہیں جا سکتا، تمہیں اکیلے ہی لے کر جانا پڑے گا۔ شیما کہنے لگی: اماں! میرے بھائی محمد ﷺ کو میرے ساتھ بھیج دیجیے۔ حلیمہ نے کہا: بیٹی! تم بکریوں کو سنبھالو گی یا بھائی کو سنبھالو گی، وہ تو گود میں رہنے والا ہے۔ اس نے کہا امی! اگر آپ مجھے اکیلا بھیجیں گی تو بکریاں مجھ سے نہیں سنبھلیں گی اور اگر بھائی کو ساتھ بھیج دیں گی تو میں بکریوں کو بھی سنبھال لوں گی اور بھائی کو بھی سنبھال لوں گی۔ حلیمہ یہ جواب سن کر حیران ہو گئی۔ پوچھا: بیٹی! کھل کر بتاؤ اصل بات کیا ہے؟ اب شیما نے بتایا:

اماں میں ایک دو مرتبہ بھائی کو لے کر گئی۔ ایک تو میں نے دیکھا کہ پورا دن بادل نے مجھ پر سایہ کیے رکھا، مجھے دھوپ میں جانا ہی نہیں پڑا اور دوسری بات میں

نے یہ دیکھی کہ جو مسافر قریب سے گزرتے تھے ان میں سے کئی راہب بھی ہوتے تھے۔ وہ اس بچے کو دیکھ کر پہلے بچے کو پیار کرتے تھے، پھر مجھ سے پوچھتے تھے کہ یہ کون ہے...... اور تیسری بات یہ ہے کہ جب میں بھائی کو لے کر گئی تو میں نے یہ دیکھا کہ میری بکریوں نے جلدی سے گھاس چر لیا۔ پھر جہاں میں بیٹھی تھی یہ بکریاں آ کر میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں۔ میں بھی اپنے بھائی کا چہرہ دیکھتی رہی اور میری بکریاں بھی اس کا چہرہ دیکھتی رہیں...... اللہ اکبر!

اللہ رب العزت نے اپنے حبیب ﷺ کو کیا حسن و جمال عطا فرمایا تھا......!!!

وَ اَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِىْ

اے محبوب! آپ سے بہتر خوب صورت چہرہ کبھی کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہے۔

وَ اَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءِ

اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی عورت نے کوئی بچہ جنا نہیں ہے

خُلِقْتَ مُبَرَّءً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ

آپ اس طرح عیبوں سے پاک اس دنیا میں پیدا ہوئے

كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

جیسا کہ اللہ نے آپ کو آپ کی مرضی کا حسن و جمال دے کر پیدا فرما دیا ہو۔

اللہ کے محبوب ﷺ کے حسن و جمال میں وہ کشش اور جاذبیت تھی کہ جو بھی دیکھتا تھا اپنے دل کا سودا کر لیا کرتا تھا۔

شیما کی محبت بھری لوری:

آپ ﷺ کی بہن شیما آپ کو گود میں لے کر لوری دیتی تھی...... ہمارے ہاں بھی عورتیں لوریاں دیتی ہیں۔ وہ اپنی اپنی زبان میں دیتی ہیں۔ ہماری والدہ جب

کسی بچے کو گود میں لیتی تو یوں کہتی تھی:

حَسْبِیْ رَبِّیْ جَلَّ اللّٰہ
مَا فِیْ قَلْبِیْ غَیْرُ اللّٰہِ

یہ پڑھ کر بچے کو لوری دیتی تھی۔ ہمارے ہی گھر میں بعض عورتیں بچوں کو گود میں لے کے اپنی زبان میں یوں لوری دیتی تھیں:

اللہ اللہ لوری
دودھ بھری کٹوری
سیفی دودھ پیے گا
نیک بن کر جیے گا

یعنی جب عورتیں بچے کو گود میں لیتی ہیں تو دعائیہ کلمات کہہ رہی ہوتی ہیں، اس میں اللہ کی یاد بھی ہوتی ہے اور دعا بھی ہوتی ہے..... شیما بھی اپنے بھائی کو گود میں لے کر بیٹھتی تو وہ بھی لوری دیتی تھیں۔ بعض سیرت نگاروں نے لوری کے وہ الفاظ اپنی کتابوں میں برکت کے لیے لکھے ہیں۔ اس لوری میں ایک فقرہ یہ بھی تھا:

رَبَّنَا اَبْقِ لَنَا مُحَمَّدًا

''اے ہمارے پروردگار! ہمارے اس بھائی محمد کو ہمیشہ سلامت رکھنا''

بی بی آمنہ کے پاس واپسی:

تین یا چار سال کی عمر میں حلیمہ سعدیہ نے یہ محسوس کیا کہ اب بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ کوئی انہونا واقعہ پیش آجائے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ میں اسے اس کی والدہ کے سپرد کر کے آؤں۔ چنانچہ انہوں نے آکر بی بی آمنہ کو ان کا لختِ جگر سپرد کر دیا۔

بے سہارا ہونے میں حکمت:

اللہ کی شان دیکھیے کہ ولادت سے پہلے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے والد فوت ہو گئے۔ پھر جب چھ سال کی عمر ہوئی تو والدہ بھی فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں آ گئے، کچھ عرصہ بعد دادا بھی فوت ہو گئے۔ پھر اپنے چچا کی کفالت میں آ گئے اور اپنی جوانی کے کچھ عرصہ بعد جب دعوائے نبوت فرمایا تو چچا بھی فوت ہو گئے۔

ایسا کیوں ہوا؟...... سب سہارے ہٹتے گئے کٹتے گئے...... اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر اس طرح کسی کے سائے میں پرورش پاتے تو دنیا کہتی کہ سہاروں میں پلنے والے، سہاروں میں زندگی گزارنے والے آج سہاروں کی نفی کر کے اللہ کو سہارا بنانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے ساتھ شروع ہی سے یہ معاملہ کر دیا...... باپ سے بھی بے سہارا...... ماں سے بھی بے سہارا...... دادا سے بھی بے سہارا...... چچا سے بھی بے سہارا...... یہ پیغام دینا تھا کہ لوگو! جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہوتا، اس کا سہارا اس کا پروردگار ہوتا ہے۔ اور جس کا سہارا اللہ بن جاتا ہے پھر اللہ رب العزت دنیا میں اس کے قدموں کو جما دیا کرتا ہے۔

آیت ''اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى'' کے معارف:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى

''کیا ہم نے آپ کو یتیم نہ پایا کہ ہم نے آپ کو ٹھکانہ دیا؟

یہ لفظ تو تھوڑے سے ہیں لیکن ان میں حقیقت بہت بڑی ہے۔ حقیقت کیا ہے؟

وہ یہ کہ

☆......آپ یتیم تھے، ہم نے ٹھکانہ دیا۔

☆......آپ بے سہارا تھے، ہم نے آپ کو سہارا دیا۔

☆......آپ غربت کدے میں پیدا ہوئے، ہم نے آپ کو فاتح مکہ بنا دیا۔

☆......جب آپ پیدا ہوئے تھے اس وقت گھر میں چراغ جلانے کے لیے تیل بھی نہ تھا اور ہم نے آپ کو ایسا بنا دیا کہ آپ کی برکت کی وجہ سے پوری دنیا میں ہدایت کا نور پھیل گیا۔

اٰوٰی کا لفظی مطلب ہے ٹھکانہ دینا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کو فرماتے ہیں:

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ "اور یاد کرو اس وقت کو جب تم تھوڑے تھے"

مُسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ "زمین پر بڑے کمزور تھے"

تَخَافُوْنَ "تم ڈرتے تھے"

اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ "کہ لوگ تمہیں کہیں اچک نہ لیں"

فَاٰوٰكُمْ "اس اللہ نے تمہیں ٹھکانہ دیا"

یہاں ٹھکانے سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کو مکہ سے مدینہ بلایا اور مدینہ میں لا کر ان کے قدموں کو جما دیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں...... اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (کیا ہم نے آپ کو یتیم نہ پایا اور ہم نے آپ کو ٹھکانہ دیا؟)......یعنی ہم نے آپ کے قدم جما دیے۔ ہم نے آپ کو دنیا و آخرت کی سرخروئی عطا فرما دی۔ ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا۔......کیسا ذکر بلند ہوا؟......سبحان اللہ!

وہ ہیں بے شک بشر لیکن تشہد میں آذانوں میں
جہاں دیکھو خدا کے نام کے بعد ان کا نام آئے

اس میں ایک پیغام پوشیدہ ہے کہ اے دنیا کے غریبو! دنیا کے بے سہارا لوگو! دنیا کے محروم لوگو! دنیا میں اپنے آپ کو یتیم کہلانے والے لوگو! تمہارے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں، میرے محبوب ﷺ کی زندگی کو دیکھو! اگر تم ان کے نقش

قدم پر چلو گے تو میں پروردگار تمہارے سر پر اپنی رحمت کا تاج رکھ دوں گا۔

اسلام میں یتیم کا مقام:

آپ ﷺ کو یتیموں کے ساتھ بڑی محبت تھی، حدیث پاک میں آیا ہے۔ عید کا دن ہے نبی علیہ الصلوۃ والسلام عید پڑھنے کے لیے اپنے گھر سے چل پڑے۔ گلی میں کچھ بچے کھیل رہے تھے، انہوں نے نہا دھو کے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان بچوں کی آنکھوں میں سرمہ بھی ڈالا ہوا تھا، تیل بھی لگا ہوا تھا۔ ان سے ذرا آگے ایک بچہ اکیلا بیٹھا تھا، وہ بڑا غم زدہ سا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ نبی علیہ الصلوۃ السلام نے بچے کو دیکھا تو آپ رک گئے۔ پوچھا: بچے! کیا ہوا؟ اتنے غم زدہ کیوں بیٹھے ہو؟...... بچے نے جواب دیا: اے اللہ کے پیارے حبیب ﷺ! میں یتیم مدینہ ہوں، میرے والد نہیں جو میرے لیے آج کپڑے لاتے، اور میری والدہ مجھے نہلا کر وہ کپڑے پہنا دیتی۔ یہ بچے آپس میں کھیل کر خوش ہو رہے ہیں اور میں بیٹھا اپنے والد کو یاد کر رہا ہوں۔

آپ ﷺ نے پوچھا، کیا تو اس بات سے خوش ہوگا اگر میں تیرا باپ بن جاؤں اور عائشہ تیری ماں بن جائے؟...... بچے کی آنکھوں میں چمک آگئی، وہ خوش ہو گیا۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے اس بچے کو پکڑا اور اسے لے کر اپنے گھر تشریف لائے۔ فرمایا: حمیرا! اس بچے کو نہلاؤ۔ وہ بچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر کا تھا، چنانچہ جتنی دیر میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کو نہلایا نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے اتنی دیر میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کپڑے منگوا لیے۔ جب بچے نے نہا لیا تو اسے دھلے ہوئے کپڑے پہنائے، سر پر تیل لگایا، پھر اس کی کنگھی کی، خوشبو لگائی اور آنکھوں میں سرمہ لگایا، اس سے وہ بچہ خوش ہو گیا۔

اب وہ خوشی خوشی نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے۔

اللہ کے نبی ﷺ زمین پر بیٹھ گئے اور بچے کو اشارہ کیا کہ تو اپنے آپ کو یتیم کہتا ہے۔ آج تو میرے ساتھ پیدل چل کر نہیں جائے گا بلکہ میرے کندھے پر سوار ہو کر جائے گا۔ چنانچہ اللہ کے محبوب ﷺ اس بچے کو کندھے پر سوار کر لیتے ہیں۔ جب اللہ کے نبی ﷺ اسے لے کر باہر گلی میں تشریف لائے تو جو بچے کھیل رہے تھے وہ حیران ہوئے کہ یہ بچہ تو چل کے جا رہا تھا اور اب اللہ کے حبیب ﷺ کے کندھوں پر بیٹھ کر آ رہا ہے۔ جب وہ بچہ ان کے قریب ہوا تو اس نے خوشی سے بتایا کہ مجھے نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے اور عائشہ ؓ میری ماں بن گئیں۔ اس بچے کی بات سن کر ان کھیلنے والے بچوں میں سے ایک نے ٹھنڈی سانس لی اور یوں کہنے لگا۔ کاش! میں بھی یتیم ہوتا اللہ کے نبی مجھے بھی اپنا بیٹا بنا لیتے۔

نبی علیہ الصلوۃ والسلام اس بچے کو لیکر اس جگہ پر تشریف لاتے ہیں۔ جہاں عید کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام ممبر کے اوپر بیٹھے، وہ بچہ نیچے بیٹھنے لگا۔ اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا: نہیں، تو آج نیچے نہیں بیٹھے گا بلکہ میرے ساتھ اس ممبر کے اوپر بیٹھے گا۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام اس بچے کو اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں اور پھر اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرماتے ہیں۔

"لوگو! جو یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھے گا اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال ہوں گے اللہ اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھوا دیگا۔"

آج یتیموں کا حق مارا جاتا ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ان کو دنیا میں جینے کا حق ہی نہیں دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا وہ خلق عطا فرمادے۔ ہمیں بھی یتیموں کا سرپرست اور والی بنا دے۔ (آمین)

شیما کی عزت افزائی کا واقعہ:

فتح مکہ ہونے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد نبی علیہ الصلوۃ والسلام حنین کی طرف

جاتے ہیں اور وہاں پر غزوہ حنین پیش آتا ہے۔ لمبی تفصیل ہے البتہ اپنی بات کو مختصر کرنے کے لیے اتنا عرض کرتا ہوں کہ غزوہ حنین میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو چھ ہزار قیدی ملے اور بارہ ہزار بکریاں ملیں جب اتنے قیدی آئے تو نبی علیہ الصلو السلام نے ارادہ فرمایا کہ ان کو صحابہ میں تقسیم کر دیا جائے۔

اتنے میں ایک صحابی نے آ کر کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ! ایک عورت آئی ہے، وہ ذرا پکی عمر کی ہے اور وہ کہتی ہے کہ میں تمہارے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی بہن ہوں، مجھے ان سے ملاؤ۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام حیران ہوئے کہ عبداللہ اور آمنہ کا میں ایک ہی بیٹا ہوں، ان کا تو کوئی اور بچہ تھا ہی نہیں۔ یہ کیسے کہتی ہے کہ میں بہن ہوں۔ صحابہ نے عرض کیا: جی وہ کہتی ہے، مجھے اپنے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس لے جاؤ۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: اچھا اسے میرے پاس لے آؤ۔ وہ خاتون آتی ہے اور کہتی ہے میں تمہاری بہن ہوں۔ پوچھا: کیسے؟ کہنے لگی: میرا نام شیما ہے، میں حلیمہ کی بیٹی ہوں، میں آپ کو گود میں لیتی تھی اور آپ کو لوریاں دیتی تھی...... رَبَّنَا اَبْقِ لَنَا مُحَمَّدًا ...... میرے رب نے میری دعا قبول کی اور میرے رب نے آج مجھے یہ منظر دکھا دیا ہے، میرے بھائی! میں قیدی بن کر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اللہ آپ کو یہ شان دیں گے۔

جب نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ سنا تو اللہ کے محبوب ﷺ نے اپنی چادر بچھا دی اور فرمایا شیما! تم میری بہن ہو آؤ! نبوت کی اس چادر کے اوپر بیٹھ جاؤ۔ دنیا نے دیکھا کہ اللہ کے محبوب ﷺ نے اپنی بہن کی کیا عزت افزائی کی! پھر نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ ارشاد فرمایا: شیما! اگر تم میرے پاس رہنا چاہو تو میں تمہارا کفیل بنوں گا اور اگر واپس رشتہ داروں میں جانا چاہو تو تمہیں جانے کی اجازت ہے۔ انہوں نے کہا: میں واپس جاؤں گی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کئی سو بکریاں بھی دیں اور کچھ

غلام بھی دیے۔ پھر دو صحابہ کرام کو فرمایا: جاؤ میری بہن کو اپنے گھر پہنچا کر آؤ۔

شیما جانے کے لیے کھڑی تو ہو گئی مگر چلتی نہیں تھی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: شیما! آپ جا نہیں رہیں؟ بہن کہنے لگی، آپ نے مجھے تو آزاد کر دیا لیکن یہ چھ ہزار بندے بھی ہیں اگر میں اکیلی چلی گئی تو لوگ کہیں گے کہ خود واپس آ گئی اور باقیوں کا خیال نہ رکھا۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے بہن کی اس بات کو قبول کر کے صحابہ کے مشورے سے سب قیدیوں کو آزاد فرما دیا......اللہ اکبر......

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی

اور میرے محبوب ﷺ! ہم نے آپ کو یتیم پایا اور پھر آپ کے قدم جما دیے، ہم نے آپ کو فاتح مکہ بنا دیا۔ اور ہم نے ہزاروں لوگوں کو آپ کے قدموں میں غلام بنا دیا۔ اسی کو کہنے والے نے کہا:

اے رسول امین، خاتم المرسلین، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
ہے عقیدہ یہ اپنا بصدق و یقیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
تیرا سکہ رواں کل جہاں میں ہوا، اس زمیں میں ہوا، آسماں میں ہوا
کیا عرب، کیا عجم، سب ہیں زیرِ نگیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

اللہ رب العزت ہمیں اس پیارے حبیب ﷺ کی مبارک سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوستو! ایسے بن جاؤ کہ جب موت کا وقت آئے اور فرشتے آ کر ہمارے دلوں کو ٹٹولیں تو وہ اسے عشق نبی ﷺ سے بھرا ہوا پائیں۔ ہمارے دماغ کو ٹٹولیں تو علم نبوی ﷺ سے بھرا ہوا پائیں۔ ہمارے اعضاء کو ٹٹولیں تو سنت نبوی ﷺ سے بھرا ہوا پائیں۔ اور اسی طرح ہم اپنے اللہ رب العزت کے حضور پیش ہو جائیں۔

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
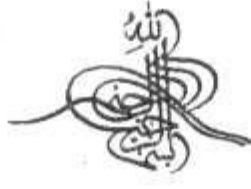
لَهُمْ قُلُوبٌ يَّعْقِلُونَ بِهَا
عقل کا نور
بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی
دامت برکاتہم

اقتباس

اگر عقل کا یہ نور انسان کے دماغ میں نہ ہو تو اس کی شکل انسانوں والی ہوتی ہے لیکن اس کا اٹھنا بیٹھنا حیوانوں والا ہوتا ہے۔ بہت خوب صورت نوجوان ہوتا ہے، اس کی رال ٹپک رہی ہوتی ہے، اسے اپنے کھانے پینے کا پتہ نہیں ہوتا، نہ کپڑے پہن سکتا ہے، نہ اوڑھ سکتا ہے اور نہ ہی صحیح بات کر سکتا ہے۔ وہ دیکھنے میں تو انسان نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں حیوان کی مانند ہوتا ہے۔ اس لیے عقلِ سلیم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

عقل کا نور

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○﴾ (الحج:۴۶)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

عقلِ سلیم......ایک نعمتِ غیر مترقبہ:

اللہ رب العزت نے انسان کو ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہم اگر ان نعمتوں کو شمار کرنا چاہیں تو شمار بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ (ابراہیم:۳۴)

''اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا بھی چاہو تو تم گن بھی نہیں سکتے''

اور اُن ان گنت نعمتوں میں سے ایک بہت نمایاں نعمت انسان کی عقل ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل سے نوازا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو اس کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ چنانچہ عقل کی وجہ سے انسان

☆......اچھے اور برے کی تمیز کر لیتا ہے۔

☆......دوست اور دشمن میں تمیز کر لیتا ہے۔

☆ ...... جائز اور ناجائز کو پہچان لیتا ہے۔

اگر عقل کا یہ نور انسان کے دماغ میں نہ ہو تو اس کی شکل انسانوں والی ہوتی ہے لیکن اس کا اٹھنا بیٹھنا حیوانوں والا ہوتا ہے۔ بہت خوب صورت نوجوان ہوتا ہے، اس کی رال ٹپک رہی ہوتی ہے، اسے اپنے کھانے پینے کا پتہ نہیں ہوتا، نہ کپڑے پہن سکتا ہے، نہ اوڑھ سکتا ہے اور نہ ہی صحیح بات کر سکتا ہے۔ وہ دیکھنے میں تو انسان نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں حیوان کی مانند ہوتا ہے۔ اس لیے عقلِ سلیم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

''عقل بڑی یا بھینس'':

ایک مرتبہ میرا چھوٹا بیٹا سیف اللہ میرے ساتھ تھا۔ ایک جگہ ہم نے ایک بھینس گزرتے دیکھی۔ میں نے بچے سے پوچھا: بیٹا! عقل بڑی کہ بھینس؟ کہنے لگا: ابو جی! بھینس۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے؟ کہنے لگا، عقل اتنی چھوٹی سی ہے اور بھینس اتنی بڑی ہے، اس لئے بھینس بڑی ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا: بھینس کے گلے میں پٹہ کون ڈالتا ہے؟ اس نے کہا: انسان۔ پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل دی ہے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ بھینس انسان کے گلے میں پٹہ نہیں ڈال سکتی، انسان بھینس کے گلے میں پٹہ ڈال کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ اس لئے عقل بھینس سے بڑی ہوتی ہے۔

انسانی عقل کے کرشمے:

آپ دیکھیں گے کہ شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ وہ ساری عمر کچا گوشت کھاتا ہے۔ وہ بغیر نمک مرچ کے کھاتا ہے۔ اس کے پاس یہ سمجھ نہیں کہ گوشت کو کھانے کے کچھ مختلف انداز بھی ہو سکتے ہیں۔

گوشت کی مختلف ڈشز:

جبکہ اس کے بالمقابل انسان کو دیکھیں۔ یہ بھی گوشت کھاتا ہے۔لیکن کیا اس میں بارہ مصالحے استعمال ہوتے ہیں اور کیا اس کی ڈشز تیار ہوتی ہیں!ان کا نام سن سن کر انسان حیران ہوتا ہے۔ یہ کیا ہے جی؟

...... یہ چکن جلفر یزی ہے،

...... یہ ڈھاکہ چکن ہے،

...... یہ فرائیڈ چکن ہے،

...... یہ سٹیم روسٹ ہے،

...... یہ ڈرم اسٹک بنی ہوئی ہے،

...... یہ چاپس بنی ہوئی ہیں،

...... یہ چپلی کباب ہیں،

......آیئے جی! ہم آپ کی دعوت کریں گے اور گھر میں باربی کیو کریں گے۔

بھونی ہوئی پوری گائے:

ایک مرتبہ شوگر ٹیکنالوجسٹ کی کانفرنس فرانس میں ہوئی۔ جب کھانے کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے ایک پوری گائے کو ذبح کر کے،اس کی کھال اتار کے،اس کے پیٹ کے اندر سے سب کچھ صاف کر کے، اسے ایک اوون کے اندر انہوں نے روسٹ کیا اور اس کو ایک سریے کے اندر پرو کے انہوں نے ایک جگہ لٹکا دیا۔ اب پانچ سو بندوں میں سے ہر بندہ جا رہا تھا اور گائے کی جس جگہ کا گوشت وہ پسند کرتا تھا وہ کاٹ کے کھا رہا تھا۔ ہم حیران تھے کہ ایک گائے کو انہوں نے مرغے کی طرح روسٹ کر کے سامنے رکھ دیا۔ مزے کی بات یہ کہ جہاں سے بھی اس کا گوشت

کاٹا جاتا تھا، وہ گلا ہوا ہوتا تھا اور اس میں مرچ مصالحہ صحیح ہوتا تھا۔ یہ نعمت انسان کو کیسے ملی؟ عقل کی بنا پر ملی۔

سبزی میں گوشت کا استعمال:

صرف یہی نہیں، بلکہ وہ گوشت کو سبزی کے ساتھ بھی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ

...... یہ جی قیمہ مٹر ہے،

...... یہ قیمہ کریلا ہے،

پھر اس کے سوپس بنا لیتا ہے۔ کہتا ہے:

...... یہ چائنیز سوپ ہے،

...... یہ کارن سوپ ہے۔

یوں لگتا ہے کہ یہ لسٹ ہی ختم نہیں ہوتی۔

عربوں کی مزے دار مندی:

انسان گوشت کو چاولوں کے ساتھ بھی استعمال کرتا ہے۔ کہتا ہے:

...... یہ جی بریانی ہے، اور

...... یہ عربوں کی بنی ہوئی مندی ہے۔

ایک صاحب ہمیں سعودی عرب میں کہنے لگے: جی آج میں آپ کو مندی کھلاؤں گا۔ وہ چاول پکوا کے لائے جو تنور میں بنائے ہوئے تھے۔ مگر اتنے لذیذ، اتنے لذیذ کہ کھانے والوں میں سے ہر بندے نے بہت ہی زیادہ جی بھر کے کھایا۔ میں نے اس سے کہا: بھئی! یہ نام کی مندی ہے، حقیقت میں بڑی چنگی ہے۔

ہاتھی کا تماشا:

انسان جانوروں کو سدھا بھی لیتا ہے۔ حالانکہ جانور طاقت اور سائز میں انسان

سے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ ہاتھی کو قابو کر لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کا وزن ٹنوں میں ہوتا ہے اور اس کی طاقت بھی بہت ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ہمیں امریکہ میں سفر کرنے کے دوران، ڈرائیور نے کہا: حضرت! ہم اس وقت ایک ایسے ایگزٹ پر پہنچ چکے ہیں کہ ہم دومنٹ کے اندر اندر ایک چڑیا گھر کے دروازے پر پہنچ جائیں گے اور اس وقت چڑیا گھر بند ہونے والا ہے۔ آخر میں وہ اپنا ایک فائنل پروگرام پیش کرتے ہیں جو بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو وہ دیکھنے چلیں، کیونکہ ہمارے پاس ٹائم بھی ہے۔ میں نے جواب میں کہا: ؎

مرغِ دل را گلشنِ بہتر زِ کوئے یار نیست

طالب دیدار را ذوقِ گل و گلزار نیست

''دل کے مرغ کو باغ دوست کی گلی سے زیادہ اچھا نہیں، دیدار کے طالب کو گل و گلزار کا ذوق نہیں ہوتا''

مگر دونوں بچے ساتھ تھے۔ ابو جی! جانور کا شو ہے، اگر ہم دیکھیں گے تو ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور اچھا بھی لگے گا۔ خیر، بچوں کا شوق دیکھ کر میں نے کہا: چلو چلتے ہیں۔ چنانچہ دومنٹ کے اندر ہم دروازے پر پہنچ گئے۔

ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے گراؤنڈ کے اندر ایک ہاتھی کھڑا تھا۔ انہوں نے اس کے گلے میں ایک بیلٹ باندھ رکھا تھا اور اس بیلٹ کے ساتھ کم از کم تین انچ موٹا اور کئی فرلانگوں کے حساب سے لمبا رسہ باندھا ہوا تھا۔ ہم لوگ کار کے اندر ہی بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

آئیٹم یہ تھا کہ جتنے لوگوں نے آج کے دن اس چڑیا گھر کو دیکھا وہ آخری وقت میں اس ہاتھی کے ساتھ رسہ کشی کریں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ وہاں ہزاروں کی تعداد میں مردوں اور عورتوں نے رسہ پکڑا ہوا ہے اور رسہ کشی کے لیے بالکل تیار کھڑے

ہیں۔

جو آدمی ان کو یہ گیم کروا رہا تھا، اس نے اعلان کیا: جی! آج تک ہسٹری میں جتنے بھی لوگ یہاں پر آئے وہ ہاتھی سے جیت نہیں سکے، آج اگر آپ لوگ ہمت کر کے جیت جائیں تو

You will be going to make a record.

(آپ ایک ریکارڈ قائم کرلیں گے)۔

اس کے بعد اس نے اشارہ کیا اور سب لوگوں نے مل کر اس کو کھینچنا شروع کر دیا۔ ہماری جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک ہمیں ایک لمبے گراؤنڈ کے اندر رسے کے ساتھ چیونٹیوں کی طرح لوگ نظر آ رہے تھے۔ جب سب نے زور لگایا تو ہم نے دیکھا کہ وہ ہاتھی ایک قدم پیچھے ہٹا...... پھر دوسرا قدم...... پھر تیسرا قدم...... جب وہ ہاتھی بارہ قدم پیچھے ہٹا تو اس شخص نے پھر اعلان کیا کہ ایک قدم باقی رہ گیا ہے، اگر آپ لوگ اب ہاتھی کو پیچھے کھینچ لیں تو آپ جیت جائیں گے اور ایک ریکارڈ قائم کرلیں گے۔ اس کے اس اعلان کے بعد لوگوں نے زور لگانے کی انتہا کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہاتھی بڑے آرام کے ساتھ ایک قدم پیچھے آجائے گا۔ لیکن جب انہوں نے زور لگانے کی انتہا کر دی تو اس وقت ہاتھی نے چلنا شروع کر دیا اور سب بندوں کو چیونٹیوں کی طرح گھسیٹتے ہوئے آگے چلا گیا۔

بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے ہاتھی کو سکھایا ہوا تھا کہ تو نے بارہ قدم پیچھے آنا ہے اور آخر قدم پر جب یہ خوب زور لگائیں تو تم نے سب کو کھینچ کر آگے کر دینا ہے۔ یہ دیکھ کر ہم بہت حیران ہوئے کہ پانچ سات ہزار بندوں کی طاقت ایک طرف اور ایک ہاتھی کی طاقت ایک طرف۔ ہاتھی پھر بھی طاقت ور ثابت ہوا۔ لیکن انسان کی عقل کو دیکھیے کہ وہ اس عقل کے بل بوتے پر اس ہاتھی کو بھی قابو میں لے کر سدھا لیتا ہے۔

ہاتھیوں کا فٹ بال میچ:

ہم نے ایک جگہ ہاتھیوں کا فٹ بال میچ دیکھا۔ ہاتھیوں کی ایک ٹیم ادھر ہے اور ایک ٹیم ادھر ہے۔ گیند بھی کوئی چھوٹا سا نہیں تھا۔ یوں سمجھیں کہ تقریباً آٹھ فٹ ڈایا میٹر کا ہوگا۔ وہ ہاتھی سونڈھ سے اس کو کک لگا رہے تھے۔ اور ایک ہاتھی ادھر گول پہ کھڑا ہے اور ایک ہاتھی ادھر گول پہ کھڑا ہے۔ باقاعدہ گیم ہوئی اور ہم نے ہاتھی کو گول کرتے ہوئے دیکھا۔ ہم حیران تھے کہ یا اللہ! اس انسان کو آپ نے عقل والی کیا نعمت دی کہ جس کے ذریعے اس نے جانور کو بھی یہ کچھ سکھا ڈالا!

ہاتھی کی پینٹنگ:

ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ہاتھی کو پینٹنگ سکھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے نو دس کلر رکھے ہوئے تھے۔ میٹر بائی میٹر کی شیٹس بھی رکھی ہوئی تھیں۔ دس ڈالر کی ایک شیٹ ملتی تھی۔ وہ اس شیٹ پر ہاتھی سے پینٹ کروا کے دیتے تھے۔

جب کوئی آدمی آکر کہتا کہ مجھے اس کلر کی پینٹنگ چاہیے، تو اس کو کنٹرول کرنے والا آدمی برش کو رنگ میں ڈبو کر سونڈھ میں پکڑا دیتا۔ ہاتھی سونڈ میں برش پکڑ کر اتنی صفائی سے اس کا شیڈ دیتا کہ لگتا تھا اس نے فائن آرٹس میں ماسٹر ڈگری لی ہوئی ہے۔ چند مرتبہ شیڈ دینے سے اتنی خوبصورت پینٹنگ تیار ہوتی تھی کہ لوگ خرید کر لے جاتے تھے اور ہاتھی کی پینٹنگ اپنے گھروں میں سجاتے تھے۔

پرندوں اور جانوروں کے کارنامے:

یہ سلسلہ بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ پہلے وقتوں میں لوگ طوطے کو بولنا سکھایا کرتے تھے۔ اللہ کا نام سکھایا کرتے تھے۔ ہم ایک صاحب کے گھر گئے۔ جیسے ہی ہم داخل ہوئے تو کسی نے کہا: ہیلو...... ہم حیران کہ یہاں کون آ گیا؟ بعد میں پتہ چلا کہ

ان کا ایک طوطا ہے جو آنے والے ہر بندے کو ہیلو بھی کہتا ہے اور جاتے ہوئے اس کو بائے بائے بھی کہتا ہے۔ بعض لوگ مینا کو بھی سکھاتے تھے، وہ بھی بولتی ہے۔

پہلے وقتوں میں کبوتر کو بھی تیار کیا جاتا تھا جو ایک بندے کا رقعہ دوسرے بندے کو پہنچاتا تھا اور اس وقت کا وہی ٹی سی ایس کا سسٹم تھا۔

گھوڑوں کو ڈانس سکھانا، ایک نارمل سی چیز تھی۔ لیکن آج کے سائنسی دور میں انسان نے اس میں بھی جدت پیدا کر لی ہے۔ سرکس کے اندر شیر کے تماشے تو بہت دنیا دیکھتی ہے۔

ایک بندر کا کراٹے کا مقابلہ:

ہم نے ایک جگہ پر ایک بندر کا کراٹے کا مقابلہ دیکھا۔ اس کے سامنے مقابلے کے لیے ایک بلیک بیلٹ آدمی تھا۔ اب دونوں آپس میں کراٹے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بندر اس کو باقاعدہ کک لگاتا ہے اور اگر وہ آدمی کک لگاتا تو یہ اس کو بلاک کرتا۔ لگتا تھا کہ بالکل دو بلیک بیلٹ لوگوں کا آپس میں مقابلہ ہو رہا ہے۔

ایک عجیب وغریب کیٹل فارم:

ہمیں ایک مرتبہ لائیو سٹاک دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں تین سو گائیاں تھیں۔ ان تین سو گائے کی کیئر ٹیکنگ (حفاظت) کے لیے صرف تین بندے تھے۔...... آج ہمارے ہاں اگر تین سو گائیں ہوں تو ان کی حفاظت کے لیے کم از کم تین درجن بندوں کی ضرورت پڑے گی...... وہاں صرف تین بندے تھے۔ وہاں چند باتیں ہم نے بڑی عجیب دیکھیں۔

◉ ...... ہر گائے کے گلے میں ایک رول نمبر ٹیگ لگا دیا گیا ہے۔ ہر گائے کی جگہ مخصوص ہے۔ اس کے گلے میں رسی نہیں ہے۔ وہ اپنی ہی جگہ پر کھڑی ہوتی ہے، بیٹھتی ہے اور

آرام کرتی ہے۔

⊙...... جب اس گائے کا نہانے کو جی چاہتا ہے تو وہ ایک جگہ، جہاں شاور لگا ہوا ہے، وہاں آ کر وہ اپنا ٹیگ کیمرے کو پڑھاتی ہے۔ کیمرہ پڑھنے کے بعد کمپیوٹر کو بتاتا ہے یہ گائے شاور لینا چاہتی ہے۔ پھر کمپیوٹر دیکھتا ہے کہ کیا یہ آج شاور لے چکی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں لیا تو اوپر سے پانی کھل جاتا ہے اور گائے خود اس کے نیچے نہاتی ہے اور اپنی جگہ پر واپس چلی جاتی ہے۔

⊙...... اس کا چارہ ایک پائپ کے ذریعے اس کی اپنی جگہ پر ڈال دیا جاتا ہے۔

⊙...... ایک چیز نے ہمیں وہاں بہت حیران کیا۔ وہ یہ کہ ان کا ملکنگ ٹائم (دودھ دوہنے کا وقت) آ گیا تھا۔ ہم نے پندرہ گائیوں کو بالکل ایک لائن میں کھڑے دیکھا۔ ان کو بتانے والا کوئی بندہ نہیں، کوئی رسی نہیں، بس ہم نے آگے ایک بندے کو دیکھا۔ اس کے پاس ایک ملکنگ مشین تھی۔ جب گائے اپنی پوزیشن پر آتی تھی تو وہ اس کے تھنوں کے ساتھ اس کی اٹیچمنٹ لگا دیتا تھا۔ یوں گائے کھڑی رہتی اور اس کا دودھ نکلتا رہتا۔ اتنے میں دوسری لائن میں کھڑی گائے کے تھنوں کے ساتھ دوسری ملکنگ مشین لگا دیتا تھا۔ جب پہلی گائے کا دودھ مکمل ہو جاتا تو وہ اپنے پاؤں سے اس اٹیچ منٹ کو خود نیچے گرا دیتی اور آگے چلی جاتی۔ جیسے ہی پوزیشن خالی ہوتی تو پیچھے انتظار کرنے والی گائے اس کی جگہ پر آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

ہم حیران ہوئے کہ آج کئی جگہوں پر انسانوں کو لائن بنانا سکھانا مشکل کام ہوتا ہے اور جہاں کوئی محنت کرتا ہے تو دیکھیے کہ جانور بھی لائن بنا کر آتے ہیں اور ملکنگ کے بعد اپنے راستے پر خود واپس چلے جاتے ہیں۔

ڈالفن مچھلی کا حیران کن کرتب:

ہمیں ایک مرتبہ بالٹی مور جانے کا موقع ملا۔ وہاں پر ایک بہت بڑا

Aquarium (مچھلی گھر) ہے۔اس میں انہوں نے بہت ہی عجیب وغریب قسم کی مچھلیاں پالی ہوئی ہیں۔ وہ چونکہ ایک ایجوکیشنل ٹرپ تھا اس لیے ہم نے سب کچھ بڑے شوق سے دیکھا اور ہمیں مچھلیوں کے بارے میں بہت معلومات ملیں۔ پھر آخر میں وہ کہنے لگے کہ جانے سے پہلے ہم آپ کو ڈالفن شو دکھائیں گے۔ چنانچہ سب لوگ بیٹھ گئے۔

ہم نے دیکھا کہ سوئمنگ پول کی طرح ایک بڑی ساری جگہ بنی ہوئی ہے اور اس میں ڈالفن تیر رہی ہے۔انہوں نے اس کے کئی کرتب دکھائے۔اس میں سے ایک کرتب واقعی عجیب تھا۔

پانی کی سطح سے تقریباً 25 سے 30 فٹ اونچا ایک بال تھا، جو انہوں نے اوپر سے نیچے لٹکایا اور ڈالفن کو اشارہ کیا کہ تم اس بال کو کک لگاؤ۔ڈالفن اس وقت سوئمنگ پول کے ایک کونے میں تھی۔ جیسے ہی اس نے کمانڈ دی، ڈالفن نے پانی کے اندر تیرنا شروع کیا اور عین وسط میں آ کر اتنی اونچی چھلانگ لگائی کہ اس نے اپنے منہ سے اس بال کو کک لگا دی۔...... یا اللہ! ایک حیوان کو بھی اتنا کچھ سکھایا جا سکتا ہے۔

اس وقت ڈالفن بہت خوش تھی۔ پھر اس نے اس خوشی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ کنارے کے قریب تیرنے لگی اور اس نے اپنی اتنی بڑی دم کے اندر پانی لے کر سب وزیٹرز پر اس طرح پھینکا کہ سب کے کپڑے تر ہو گئے۔تو دیکھیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل کے نور سے نوازا اور انسان نے اس عقل کے ذریعے جانوروں کو بھی سدھا لیا۔

انسان کی مادی پرواز:

انسان آج ایسے کام بھی کر سکتا ہے جن کے بارے میں پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ صرف جانور اور پرندے ہی کر سکتے ہیں۔مثال کے طور پر:

◉...... چیتا بہت تیز دوڑتا تھا۔لوگ کہتے تھے کہ چیتے جیسا تیز کوئی بھی نہیں دوڑ سکتا۔ انسان نے کار بنالی اور چیتا اب دیکھتا رہ جاتا ہے اور کار والا بندہ آگے نکل جاتا ہے۔

◉......اونٹ کو لدا ہوا دیکھ کر انسان حیران ہوتا تھا۔آج ماشاءاللہ NLC کے ٹریلر چالیس اور پچاس فٹ تک لمبے ہوتے ہیں۔حیران ہوتے ہیں کہ اتنے وزن کو لے کر انجن سڑک پر آسانی سے چل رہا ہوتا ہے۔

◉...... پہلے زمانے میں شاہین کی پرواز دیکھ کر لوگ حیران ہوتے تھے۔آج انسان نے جہاز بنالیا ہے۔چنانچہ آج شاہین کی پرواز نیچی نظر آتی ہے اور جہاز کی پرواز اونچی نظر آتی ہے۔

فروٹ فلائی سے نجات کا انوکھا طریقہ:

انسان نے جانوروں کو خوب قابو کیا ہے۔اس قابو کرنے کی ایک چھوٹی سی مثال میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں:

ہمارے ملک میں جب امرود کے پھل کا موسم ہوتا ہے تو ایک مکھی، جسے فروٹ فلائی کہتے ہیں، وہ لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جاتی ہے، جیسے مچھر پھرتے ہیں، اور اس کا کام یہ ہے کہ وہ فروٹ کو اپنے سونڈ کے ذریعے سے پک کرتی ہے اور اس کے اندر ایسی چیز ڈال دیتی ہے کہ جس سے وہ فروٹ خراب ہو جاتا ہے۔چنانچہ باغبان بہت پریشان ہوتے ہیں کیونکہ اس مکھی کو مکمل طور پر ختم کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتی ہے اور ہوتی بھی بہت چھوٹی ہے۔ماریں تو کیسے ماریں؟اس کی وجہ سے فروٹ خراب ہو جاتا تھا۔

اس پر سائنس دانوں نے کام کرنا شروع کیا اور اس کا ایک عجیب حل نکالا!وہ ب

کہ فروٹ فلائی جب اپنے میل (نر) کے ساتھ میٹ (ملاپ) کرنے لگتی ہے تو اس کے جسم سے ایک خاص قسم کی Smell (بو) نکلتی ہے۔ میل (نر) جب اس بو کو محسوس کرتا ہے تو وہ فیمیل (مادہ) کی طرف آتا ہے۔ ان سائنس دانوں نے اس بو کو پہچان کر اس طرح کی بو بنا دی اور اس بو کے لیے خاص ٹریپ بنا دیے۔ یعنی ایک ٹریپ میں کپاس رکھ دی جس میں وہ بو ہوتی ہے۔ جیسے ہی وہ بو آتی ہے تو ایک دو کلومیٹر سے جتنے بھی میل (نر) ہوتے ہیں وہ اس بو کی طرف بھاگتے ہیں، کیونکہ اس کی کشش ہی اتنی ہوتی ہے۔ وہاں جو بھی نر آتا ہے وہ زہر کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ جب نر ہی مر گئے تو مادہ حاملہ کیسے ہو؟ بچے کیسے دے اور ان میں اضافہ کیسے ہو؟ چنانچہ اب نہ ان میں اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی وہ پھل کو خراب کر سکتے ہیں۔ ہم حیران ہوئے کہ کیا ٹیکنیکل نکتہ نکالا کہ انہوں نے اس کا مسئلہ ہی حل کر کے رکھ دیا۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ انسان نے عقل کی وجہ سے ایک مسئلہ حل کر لیا۔

نظریہء اضافت کی بنیاد:

عقل کے اندر اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت پیدا کی ہے۔ چنانچہ دنیا میں انسان نے کچھ کام فقط عقل کی وجہ سے کیے۔ کچھ کام انسان دیکھ کر کرتا ہے، کچھ سن کے کرتا ہے، کچھ چیزوں کو چکھ کے محسوس کرتا ہے۔، کچھ کو ہاتھ لگا کر محسوس کرتا ہے، مگر کچھ کاموں کو فقط عقل کی وجہ سے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

آئن سٹائن ایک ایسا سائنس دان ہے جس نے تھیوری آف ریلیٹویٹی (نظریہء اضافت) کا تصور پیش کیا۔...... آج سائنس کی دنیا میں اس کا ایسے احترام کیا جاتا ہے جیسے دین والوں کے ہاں پیغمبروں کا احترام کیا جاتا ہے...... اس بندے نے سوچا کہ فرض کرو کہ ایک فریم آف ریفرنس ہے۔ تو بات ایک فرضی خیال سے شروع

کی۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے فقط اپنی سوچ سے کام لیا۔ اس نظریے کی بنیاد سوچ سے آگے چل رہی ہے کہ فرض کرو کہ ایک فریم آف ریفرنس ہے۔ پھر اس نے وہاں سے ایک فریم آف ریفرنس لیا، پھر دوسرا لیا، پھر کیلکولیشن شروع کر دی۔ اس نے جتنا بھی کام کیا اس کا تعلق نہ آنکھ سے تھا، نہ کان سے تھا اور نہ ہی کسی اور چیز سے تھا۔ اس کا تعلق فقط عقل کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس نے عقل کے ذریعے ہی کیلکولیشن کرتے کرتے ایک نتیجہ نکالا کہ:

$$E = mc2$$

یہ ایک ایسی مساوات تھی جس نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ لہٰذا آج اس کو استعمال کر کے انسان معلوم نہیں کیا کیا عجیب وغریب چیزیں بنا رہا ہے۔ تو یہ کس کی طاقت تھی؟ یہ عقل کی طاقت تھی۔ اس نے یہ عقل کے ذریعے ہی سمجھا کہ ٹائم Dialate (تبدیل) بھی ہو سکتا ہے، لمبائی Constraction (کم) بھی ہو سکتی ہے اور اسی طرح مختلف تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔ گویا عقل کے ذریعے انسان دنیا میں رہتے ہوئے مادی فائدے حاصل کر سکتا ہے۔

انسانی عقل کا کمال:

انسان کے دماغ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کمپیوٹر کے اندر ایک میس کو پروسیسر ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر پروگرام میں اگر کوئی بھی ایکوایشن (مساوات) آ جائے تو وہ ایکوایشن میس کو پروسیسر کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اور وہ اس ایکوایشن کو حل کر کے اس کا جواب واپس دے دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپ انسان کو ایک خیال دے دیجیے...... فوڈ فار تھاٹ...... اور پھر اس کے اوپر خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے انسان پوری عمارت کھڑی کر دیتا ہے۔ یہ جو ایک نعمت ہے کہ ایک خیال کو آگے بڑھاتے بڑھاتے معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا، یہ انسان کی عقل کا کمال ہے۔

سوچ کے دو انداز:

انسان کی سوچ کے دو انداز ہوتے ہیں۔ ایک کو کہتے ہیں ''مثبت انداز'' اور دوسرے کو کہتے ہیں ''منفی انداز''۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔ میرے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس ہے۔ اس گلاس کو دیکھ کر لوگ دو طریقے کے نتیجے نکال سکتے ہیں۔ ایک بندہ اس کو دیکھ کر کہتا ہے: جی آدھا خالی ہے۔ ہاں ٹھیک کہہ رہا ہے کہ آدھا خالی ہے۔ اب اس کہنے والے نے منہ بھی بنایا اور کہا کہ آدھا خالی ہے۔ اور ایک اور بندے نے اس کو دیکھ کر خوش ہو کر کہا: دیکھو جی آدھا بھرا ہوا ہے۔ جس نے کہا کہ آدھا خالی ہے، وہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے اور جس نے کہا کہ آدھا بھرا ہوا ہے وہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے، مگر ایک سوچ کا مثبت انداز ہے اور دوسرا سوچ کا منفی انداز ہے۔

انسانی شخصیت پر سوچ کے اثرات:

یاد رکھیں جیسی انسان کی سوچ ہوتی ہے اس کی شخصیت پر ویسے ہی اثرات ہوتے ہیں۔ مثبت سوچ کے مثبت اثرات اور منفی سوچ کے منفی اثرات ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

⊙ ...... ایک آدمی بات کر رہا تھا کہ میں گلاب کے پودے سے پھول توڑنے لگا تو مجھے کانٹے چبھ گئے، یہ کیا بات ہے جی! جہاں پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے ہوتے ہیں۔ دوسرے بندے نے اس سے کہا: اللہ کے بندے! یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جہاں کانٹے ہوتے ہیں وہاں پھول بھی ہوتے ہیں۔ اب اگر وہ بات کو اس طرح سوچے کہ جہاں پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے ہوتے ہیں تو اس منفی سوچ کی وجہ سے اس کے اندر فرسٹریشن پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ یوں کہے کہ اگر دنیا میں کانٹے ہوتے ہیں تو پھر ساتھ پھول بھی ہوتے ہیں، اس سے اس کے دل میں اللہ کا شکر کرنے کا احساس

پیدا ہوگا۔

⊙ ...... دو قیدی تھے۔ ان کو جیل میں ڈالا گیا تھا۔ ان کو تھوڑے سے وقت کے لیے نکالا گیا تاکہ وہ تازہ ہوا کے اندر چل پھر لیں۔ پھر دس پندرہ منٹ کے بعد ان کو دوبارہ قید کر دیا گیا۔ جب دوبارہ جیل میں بند ہو گئے تو ایک نے کہا: یار! لگتا ہے کہ باہر بارش ہوئی ہے۔ دوسرے نے کہا: ہاں مجھے بھی لگتا ہے کہ باہر بارش ہوئی ہے۔ ایک نے پوچھا: تمہیں کیسے پتہ چلا؟ اس نے کہا: میں نے زمین پر دیکھا کہ بہت کیچڑ تھا اور ہر طرف گند پھیلا ہوا تھا۔ پھر اس نے دوسرے سے پوچھا: تمہیں کیسے پتہ چلا؟ وہ کہنے لگا کہ میں نے درختوں کو دیکھا کہ ان کے پتے دھلے ہوئے تھے اور پودوں کے پھول بہت ہی مہک رہے تھے اور تر و تازہ نظر آ رہے تھے، مجھے اس سبزے کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ شاید بارش ہوئی ہے۔ یہی مثبت اور منفی سوچ کا فرق ہے کہ دیکھیں! دو بندے ہیں۔ ایک کی نظر نیچے کیچڑ پر پڑی اور دوسرے کی نظر پھولوں اور پتوں پر پڑی۔

شوگر فری تربوز:

اگر کوئی مثبت سوچ رکھنے والا ہو تو اپنی مشکل کا حل نکال لیتا ہے اور اگر منفی سوچ والا ہو تو وہ ہمت ہار کے نقصان کر بیٹھتا ہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں ایک کسان سیزن کے شروع شروع میں اپنے تربوز توڑ کر لایا کہ ریٹ اچھا ملے گا۔ اللہ کی شان کہ جب اس نے تربوز کھولے تو وہ اندر سے تھے تو سرخ، مگر پھیکے تھے۔ ایک بندے نے خریدا تو اس نے کہا کہ یہ تو میٹھا ہی نہیں۔ دوسرے نے خریدا تو اس نے بھی کہا کہ یہ تو میٹھا ہی نہیں۔ وہ بڑا پریشان ہوا مگر وہ بندہ ہمت والا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب جو کچھ ہے، وہ تو ہے ہی، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے، مجھے اس کا کوئی حل نکالنا چاہیے۔

چنانچہ اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ بالآخر وہ ایک پینٹر کے پاس گیا اور اس سے

جا کر کہا: مجھے ایک بڑا سا سائن بنا کر دو۔ اس نے پوچھا: اس پر کیا لکھوانا ہے؟ کہنے لگا: اس کے اوپر لکھو۔

''لاہور میں پہلی مرتبہ شوگر فری تربوز''

اب جب اس نے شوگر فری کا لفظ لکھ دیا تو کسی نے کہا: میں امی کے لیے لے کر جاتا ہوں، میں ابو کے لیے لے کر جاتا ہوں۔ اس طرح اس کے پھیکے تربوز ڈبل ریٹ پر سارے کے سارے بک گئے۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کو کوئی چیز دیکھ کر فوراً فرسٹریشن میں نہیں آنا چاہیے، بلکہ اس کا وے آؤٹ نکالنا چاہیے۔ ہمارے بزرگ جو نوجوانوں سے یہ کہتے تھے کہ بھائی! ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو، وہ اسی لیے کہتے تھے کہ دنیا کے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے، لہٰذا بیٹھ کر سوچو اللہ تعالیٰ کوئی اچھی تدبیر ذہن میں ڈال دیں گے۔

متبادل راستہ:

بالفرض آپ کسی روڈ پر چل رہے ہیں۔ چلتے چلتے سامنے دیکھتے ہیں کہ روڈ بالکل بلاک کر دیا گیا ہے۔ چار فٹ اونچی اینٹوں کی دیوار بنا دی گئی ہے۔ اب آپ وہاں کار کھڑی کر کے بیٹھ تو نہیں جاتے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ روڈ بلاک کر دیا گیا ہے، لگتا ہے کہ کنسٹرکشن (تعمیر) کا کام ہو رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے دائیں یا بائیں جانب کوئی متبادل راستہ بھی بنایا ہوگا۔ تو جب آپ دائیں بائیں دیکھتے ہیں تو آپ کو ایک راستہ جاتا نظر آتا ہے۔ آپ اس کچے راستے پر تھوڑی دیر کے لیے چلتے ہیں۔ وہ راستہ آپ کو وہاں سے نکال کر پھر سڑک پر ڈال دیتا ہے۔ انسان کی مثال بھی بالکل اسی طرح ہے۔ اگر زندگی میں کسی وقت بھی کوئی کرائسز کنڈیشن محسوس ہو رہی ہو تو بھئی! اب جھگڑا کر کے نہیں بیٹھ جانا بلکہ اس کا کوئی وے آؤٹ (حل) نکالنا ہے۔ اس کا حل

نکالنے کا یہی طریقہ ہے کہ دیکھا جائے کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور بہترین حل کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ عقل کے نور سے انسان کو کوئی نہ کوئی حل ضرور بتا دیں گے۔

جیسی سوچ ویسی باتیں:

جیسی سوچ ہوتی ہے انسان اسی طرح سے بات کرتا ہے۔ اور بات کرنے سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

⊙ ......ایک ہی بات اگر آپ ذرا غیر مہذب طریقے سے کریں تو اگلا بندہ تھپڑ لگا دے گا اور اگر اسی بات کو مہذب طریقے سے کریں تو اگلا بندہ آپ کا احسان مند ہو گا......مثال تو ذرا عجیب سی ہے......اگر آپ کسی سے کہیں کہ آپ کے ابو جان آ رہے ہیں تو وہ شکریہ ادا کرے گا اور اگر آپ اس سے کہیں کہ تمہاری ماں کا یار آ رہا ہے تو وہ جوتا اتار کے سر پر مارے گا۔ حالانکہ حقیقت تو دونوں باتوں کی ایک جیسی ہے، مگر بات کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

⊙ ......ایک بادشاہ نے خواب دیکھا کہ اس کے کئی دانت گر گئے۔ وہ بڑا پریشان ہوا کہ خواب میں میں نے دانت گرتے ہوئے دیکھے۔ اس نے صبح تعبیر کرنے والے کو بتایا۔ اب وہ تعبیر بتانے والا ذرا رف قسم کا بندہ تھا۔ اس نے خواب سن کر کہا: بادشاہ سلامت! آپ کے دانت گرے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے سامنے اپنے کئی رشتہ داروں کو مرتے دیکھیں گے۔ اب جیسے ہی اس نے تعبیر بتائی تو بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے کہا: اسے دو چار جوتے لگا دو اور یہاں سے بھگا دو، یہ ایسی بری تعبیر بتا رہا ہے۔

اس کے بعد وہ پھر بھی خواب کی وجہ سے پریشان تھا کہ آخر اس کی کوئی نہ کوئی تعبیر تو ہوگی۔ چنانچہ ایک اور بندے کو بلایا گیا۔ وہ بندہ ذرا سمجھدار تھا۔ اس کو بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ لہٰذا جب اس نے خواب سنا تو اس نے کہا: بادشاہ سلامت! یہ تو بہت

اچھا خواب ہے، آپ کو مبارک ہو۔ بادشاہ نے پوچھا: کیسے؟ اس نے کہا: آپ اپنے تمام رشتہ داروں سے زیادہ لمبی عمر پائیں گے۔ بادشاہ اس تعبیر سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ اس کو انعام دے کر روانہ کر دو۔

اب دیکھیے باتیں تو دونوں کی ایک جیسی ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا انداز مختلف ہے۔ ایک انداز سے بندہ ناراض ہو جاتا ہے اور دوسرے سے بندہ خوش ہو جاتا ہے۔

انسانی رویہ میں سوچ کا اثر:

جس طرح سوچ کا انسان کی شخصیت پر گہرا اثر ہوتا ہے اسی طرح انسان اپنی شخصیت کے مطابق آگے رویہ اختیار کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مکھیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک کو گندی مکھی کہتے ہیں، اس گندی مکھی کی سوچ بھی گندی ہوتی ہے۔ اس کو ہر وقت گندگی کی تلاش ہوتی ہے۔ جہاں بھی دیکھو، یہ صاف ستھری جگہ کو چھوڑ کر گندی جگہ پر بیٹھی ہوگی۔ مثال کے طور پر: اتنے خوبصورت جسم کو چھوڑ کر یہ مکھی زخم اور پیپ کے اوپر جا کر بیٹھے گی۔ اتنے خوب صورت گھر کو چھوڑ کر کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے گی۔ چونکہ اس کی سوچ گندی ہوتی ہے اس لیے اسے گندگی کی ہی کی تلاش رہتی ہے اور گندی جگہوں پر پائی جاتی ہے۔

ایک شہد کی مکھی بھی ہوتی ہے۔ اس مکھی کی سوچ اچھی ہوتی ہے، اس کو ہر وقت اچھائی کی تلاش ہوتی ہے، یہ نیکٹرز ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ اکثر و بیشتر پھولوں کے باغ میں اور پھلوں کے باغ میں پائی جاتی ہے۔ کہیں سے پھل کا رس لے رہی ہوتی ہے اور کہیں سے پھول کے اندر سے پولن لے رہی ہوتی ہے۔ یہ صاف ستھری اور خوشبو دار جگہوں پر پائی جاتی ہے اور جب یہ وہاں سے نیکٹر پولن لے کر آتی ہے تو اپنے چھتے کے اندر آ کر شہد بناتی ہے۔ یہ ہنی (شہد) اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان اظہارِ محبت کے لیے اپنی بیوی کو ’’ہنی‘‘ کہتے

ہیں۔ہنی اتنا لذیذ تو ہوتا ہے نا کہ اظہار محبت کے لیے علامت بن گیا ہے۔تو معلوم ہوا کہ اس مکھی کی سوچ اچھی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو پروڈکٹ بھی اچھا دے دیا۔

جس طرح مکھی کی دو مثالیں ہیں اسی طرح انسان بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ بالکل گندی مکھی کی مانند ہوتے ہیں۔ان کی سوچ بھی گندی ہوتی ہے،انہیں ہر وقت گندگی کی تلاش رہتی ہے۔وہ کسی کی اچھائیوں کو نہیں دیکھتے،ان کی نظر ہمیشہ برائی کے اوپر پڑے گی۔ان کو اچھی مجالس بھی اچھی نہیں لگتیں۔جس مجلس میں غیبت ہو،الزام تراشی ہو،تنقید ہو اور نکتہ چینی ہو تو ان کو وہ مجالس بڑی اچھی لگتی ہیں۔وہ اتنے بے زار ہوتے ہیں کہ نہ بڑوں سے خوش ہوتے ہیں اور نہ اپنوں سے راضی رہتے ہیں۔نہ بیوی سے خوش،نہ بچوں سے خوش،نہ دین والوں سے خوش،حتی کہ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی خوش نہیں ہوتے۔وہ اپنے آپ سے بھی بے زار ہوتے ہیں۔گندی سوچ رکھنے والوں کی آنکھ میں چشمہ ایسا لگ چکا ہوتا ہے کہ ان کو ہر ایک میں عیب نظر آتے ہیں۔بھئی! دوسروں کی غلطیوں کو تم اتنا ڈھونڈ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ تمہیں دوسرے کی آنکھ کا بال تو نظر آرہا ہے،اپنی آنکھ کا شہتیر کیوں نظر نہیں آرہا؟ اپنے آپ کو نہیں دیکھتے کہ میرے اندر کیا ہے؟ ان کو دوسروں کی برائیاں نظر آرہی ہوتی ہیں۔اس قسم کے لوگ دین بیزار اور خدا بیزار بن جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کی سوچ اچھی ہوتی ہے۔جیسے شہد کی مکھی کی سوچ ہوتی ہے۔اس کے دماغ میں نیکی ہوتی ہے۔وہ نیکی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ان کا دل نیک مجالس میں بیٹھنے کو کرتا ہے۔نیکوں کے ساتھ ان کا تعلق جڑا رہتا ہے۔ان کو دوسروں کے اندر نیکی نظر آتی ہے۔ان کے سامنے دنیا کا برا بندہ بھی پیش کر دو تو وہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی اچھائی ڈھونڈ لیں گے کہ اس میں یہ اچھائی بھی پائی جاتی ہے۔اس لیے کہ وہ مثبت سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔لہٰذا ان کو ہر ایک میں اچھائی نظر آتی ہے۔ایسا بندہ بیزی

بی (شہد کی معروف مکھی) کی طرح زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ نیکی کے کاموں میں لگا ہوتا ہے۔ اس کے پاس کسی کا تذکرہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔...... کام سے کام...... اس کی زندگی پروڈکٹو (تعمیری) گزر رہی ہوتی ہے۔ یہ معاشرے کے اندر ایک مقصد بھری زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔

ازدواجی زندگی میں سوچ کا کردار:

ازدواجی زندگی کی کامیابی کے لیے انسان کی سوچ کا اچھا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کوئی بھی میاں بیوی جن کی سوچ منفی ہوگی وہ کبھی بھی خوشیوں بھری زندگی نہیں گزار سکتے۔ بلکہ ہم نے دیکھا کہ منفی سوچ رکھنے والا خاوند اپنی بیوی سے جھگڑ رہا ہے، لڑ رہا ہے۔ جب پوچھا کہ بھئی! اتنے غصے میں کیوں آئے؟ تو کہنے لگا: اس نے اپنے سگے بھائی کی طرف مسکرا کے کیوں دیکھا؟ اب بتاؤ کہ بہن اگر اپنے سگے بھائی کو مسکرا کر دیکھے تو خاوند کو اس سے بھی شک پڑ جاتا ہے۔ اس کی سوچ منفی ہے۔ لہٰذا اسے اب ہر وقت ایسی ہی چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔ اور اگر انسان کی سوچ اچھی ہو تو پھر اسے دوسرے کی اندر بہت سی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اگر سوچ اچھی نہ ہو تو انسان جب اپنی بیوی سے ذرا سی بات پر بھی ناراض ہوگا تو کہے گا کہ دس سال ہو گئے، شادی کو، میں تو ذلیل ہی ہو گیا ہوں۔ وہ اس بات کو بھول گیا کہ اس نے مجھے بیٹے بھی دیے، بیٹیاں بھی دیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھی جاب (ملازمت) دی، رزق دیا اور میں نے زندگی میں کتنے خوشیوں بھرے لمحات گزارے ہیں، وہ ساری باتوں پہ پانی پھیر کے بس ایک بات کہہ دیتا ہے کہ دس سال سے میرا سکون ختم ہو چکا ہے۔

اور کبھی کبھی یہی بات بیوی کی طرف سے بھی ہو جاتی ہے کہ خاوند اس پر خرچ کرتا ہے، اس کے ساتھ پیار محبت سے پیش آتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور ذرا سی

بات پر بیوی ناراض ہو کر کہتی ہے کہ آپ میرے لیے کیا کرتے ہیں؟ جو کرتے ہیں اپنے بچوں کے لیے کرتے ہیں، میرے لیے کچھ نہیں کرتے۔ یوں سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ یہ ناشکرا پن اللہ تعالیٰ کو اتنا ناپسند ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے عورتوں کو کثرت سے جہنم میں جلتے دیکھا۔ ام المومنین ؓ نے پوچھا: اے اللہ کے نبی ﷺ! آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: وہ چیزوں پر لعن طعن بہت کرتی ہیں، تنقید بہت کرتی ہیں اور اپنے خاوند کی ناشکری بہت کرتی ہیں۔ سب کیے دھرے پر پانی پھیر کر رکھ دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اتنی ناپسند ہے کہ وہ ایسے بندوں کو جہنم کا ایندھن بنا دیتا ہے۔

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تمہیں اپنی بیوی کے اندر کوئی بات بری لگے تو تم غور کرنا، تمہیں اس کے اندر کتنی ہی باتیں پسندیدہ نظر آئیں گی''۔ اگر اس کے اندر اتنی پسندیدہ باتیں ہیں تو تھوڑا سا تحمل اور کلیئرنس تو تمہارے اندر بھی ہونا چاہیے۔

آج انڈسٹریل (صنعتی) زمانہ ہے۔ مشینیں بن رہی ہیں۔ ان مشینوں کے بننے کا ایک طور طریقہ ہے کہ اگر شافٹ کا یہ سائز ہو تو بیرنگ کا سائز اتنا ہونا چاہیے۔ اب اس کے اندر اتنے ہزار کلیئرنس ہوتی ہے۔ اگر ان اصولوں کے مطابق مشین بنا دیں تو پارٹس بھی بڑے آرام سے فٹ ہوتے ہیں اور مشین بھی بڑے مزے سے چلتی ہے۔ اور اگر کلیئرنس کو زیرو کر دیں تو نہ پارٹس فٹ ہوں گے، نہ مشین اسمبل ہوگی اور نہ ہی کوئی پروڈکشن ہوگی۔ کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس گھر کے خاوند میں یا بیوی میں ٹالرنس کلیئرنس زیرو ہوگئی آپ سمجھ لینا کہ اس گھر کی گاڑی اب آگے چلنی ممکن نہیں۔

چنانچہ انسان تھوڑا سا سمجھداری سے کام لے اور دل بڑا رکھے۔ خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنا اسی بندے کا کام ہے جس کا دل ذرا بڑا ہوتا ہے۔ کہنے والوں

نے کہا:

To run a big sbow, one should have a big heart.

''بڑی اچھی زندگی گزارنی ہوتو پھر دل بھی بڑا کرنا پڑتا ہے''

پریشانیاں تو آتی ہیں۔ آج کون سا بندہ ہے جو پریشانیوں سے بچا ہوا ہے؟ یہ دنیا تو ہے ہی ''مسائلستان''۔ جس گھر میں دیکھو کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ البتہ نوعیت جدا ہوتی ہے۔ جس کاروبار میں دیکھو، اس میں بھی مسئلے ہیں، مگر نوعیت جدا ہوتی ہے۔ تو جب ہم مسائل میں ہی زندگی گزار رہے ہیں تو یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ روز ہی مسئلے ہوں گے۔ اور ہم نے ہی ان کو حل کرنا ہے۔ پھر ان کو حل کرنے کے لیے صبر وتحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اچھی ازدواجی زندگی وہی گزارتے ہیں جن کے اندر صبر وتحمل ہوتا ہے۔ اگر یہ صبر وتحمل ختم ہو جائے اور انسان بے صبرا بن جائے تو بس آپ سمجھ لیں کہ اب اس کی زندگی کے مسائل میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی سوچ کو اتنا اچھا بنالیں کہ ہم دوسروں کے لیے رحمت بن کر رہیں، دوسروں کے لیے زحمت بن کر نہ رہیں۔

اگر کوئی بندہ آپ کی بات نہیں سمجھ رہا تو آپ ذرا غور کریں اور سوچیں کہ آخر یہ سمجھ کیوں نہیں رہا؟ اگر آپ اس کے انداز سے سوچنے کی کوشش کریں گے تو فوراً پتا چل جائے گا کہ اس کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آرہی۔

Put yourself in other's shoes.

اور پھر آپ کو پتہ چل جائے گا کہ وہ بندہ آخر اس طرح کیوں سوچ رہا ہے۔

عام طور پر میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ خاوند نے کہا کہ بیٹے کا رشتہ بھائی کے گھر کرنا ہے، بیوی نے کہا: بیٹے کا رشتہ میں نے بہن کے گھر کرنا ہے۔ پھر یہ بات جھگڑے کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ بھائی! یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ

نہیں، یا تو صلح صفائی سے ایک دوسرے کی سمجھ لیں یا سمجھا دیں۔ غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے شریعت نے اختلاف رائے کو جرم نہیں کہا۔ جبکہ آج ذرا سا کوئی اختلافِ رائے کر دے تو وہ ہمیشہ کے لیے دشمن سمجھا جاتا ہے۔ شریعت نے ایسا نہیں کہا۔ شریعت کہتی ہے کہ تم ذرا سوچو کہ آخر وہ بندہ اس طرح کیوں سوچ رہا ہے۔ جب آپ سوچیں گے تو آپ کو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

استاد کی شکست:

کئی پرائمری سکولوں میں پڑھانے والے استاد جب بچے سے کوئی چیز سنتے ہیں اور وہ آگے سے سنا نہیں سکتا تو وہ اسے تھپڑ لگا دیتے ہیں۔ یہ مارنا، اس بات کی علامت ہے کہ اس بندے نے شکست تسلیم کر لی کہ میرے اندر اتنی صلاحیت نہیں کہ میں زبان سے اس بچے کو سمجھا سکوں۔ گویا مارنا تو اپنی شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جو لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں وہ پیار سے اپنے بچوں کو سمجھا لیتے ہیں۔ ان کو مارنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ جبکہ کئی لوگ ذرا سی بات پر ایسے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ جیسے ان کے دماغ میں آگ بھری ہوئی ہے۔ وہ گھر والوں کے لیے مصیبت بنے ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کو ایسی صورتِ حال سے بچانا چاہیے۔

غصہ کمزوری کی علامت ہے:

اکثر و بیشتر غصہ کمزوری کی علامت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جوان کو غصہ کم آتا ہے اور بوڑھے کو زیادہ۔ اس لیے کہ بوڑھے کے اندر اس کو برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اسے ذرا ذرا سی بات پر غصہ آتا ہے۔ اسی لیے بندہ بڑھاپے میں جا کر چڑچڑا بن جاتا ہے۔ عمر جتنی بڑھتی جاتی ہے، چڑچڑاپن بھی اتنا ہی

بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ایک بڑے میاں ڈاکٹر کے پاس گئے۔

اس نے کہا: ڈاکٹر صاحب! نظر کمزور ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر نے کہا: بڑھاپا ہے۔

اس نے پھر کہا: ڈاکٹر صاحب! اونچا سنائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا: بڑھاپا ہے۔

اس نے کہا: ڈاکٹر صاحب! میرے چار پانچ دانت بھی گر گئے ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا: بڑھاپا ہے۔

اس نے کہا: ڈاکٹر صاحب! مجھے چیزیں یاد نہیں رہتیں۔

ڈاکٹر نے کہا: بڑھاپا ہے۔

جب ڈاکٹر نے بار بار کہا کہ بڑھاپا ہے، بڑھاپا ہے، تو بوڑھے کو غصہ آیا اور غصے میں کہنے لگا: یہ کیا؟ بڑھاپا ہے، بڑھاپا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا: بڑے میاں! یہ بھی بڑھاپا ہے۔

بوڑھوں کی قوتِ برداشت اتنی کم ہو جاتی ہے کہ وہ ہوا کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔ تو نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ پر غصے کو حاوی نہ ہونے دیں۔ بلکہ غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے نبی علیہ السلام نے پوچھا: پہلوان کون ہے؟ اور پھر صحابہ ﷡ کو سمجھایا کہ جو اپنے غصے کو قابو میں کر لے، اللہ کی نظر میں وہ پہلوان کی مانند ہوتا ہے۔ تو اگر بندے کے اندر صبر ہو، حلم ہو اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے اچھے اخلاق ہوں تو انسان کی زندگی بہت اچھی گزرتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی بندہ ایک بات کو قبول نہیں کر رہا ہوتا تو ضرور سوچیں کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ تھوڑا سا سوچنے سے وہ وجہ بھی سمجھ میں آجائے گی۔

باپ بیٹے کی سوچ کا انداز:

ایک انجینیئر اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی ڈرائنگ بنا رہا تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا بھی گھر میں تھا۔ اس کی بیوی کسی کام کے سلسلے میں کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس لیے بچہ بھی اس کو سنبھالنا تھا۔ اب بچہ بھی اسی کے کمرے میں تھا۔ کبھی وہ اس کتاب کو چھیڑتا اور کبھی اس کتاب کو...... ہم نے اکثر و بیشتر دیکھا ہے کہ انجینئرز اور ڈاکٹرز کے کمروں کی حالت عجیب ہوتی ہے۔ کہیں کتابیں پڑی ہوتی ہیں، کہیں کاغذ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان بے چاروں کے پاس ان کو ترتیب سے اور صفائی سے رکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ ان کی گاڑیاں بھی قابل دید ہوتی ہیں اور ان کے کمرے بھی قابل دید ہوتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی صفائی رکھنے والا ہو تو الگ بات ہے۔ ورنہ اکثر و بیشتر ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ اپنی اپنی طبعیت ہوتی ہے۔...... بہر حال انجینئر کے ہر طرف کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ ادھر بھی کاغذ ادھر بھی کاغذ۔ چنانچہ جب بچہ کسی کاغذ کو ہاتھ لگاتا تو وہ کہتا: بیٹا! یہ ڈرائنگ ہے، اس کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ پھر وہ دوسرے کاغذ کو ہاتھ لگاتا تو وہ کہتا: بیٹا! اسے ہاتھ نہ لگاؤ یہ میرا قیمتی کاغذ ہے۔ اب وہ کام کر ہی نہیں پا رہا تھا۔ بچہ اسے خوب ڈسٹرب کر رہا تھا۔ اس کا یہ بھی جی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اپنے بچے کو ڈانٹوں یا کمرے سے نکالوں۔ آخر اس کا بیٹا تھا۔ دل کا ٹکڑا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ میں اس بچے کو کہیں مصروف کرتا ہوں۔ چنانچہ اس کے سامنے ایک اخبار پڑا ہوا تھا اور اس کے اوپر پوری دنیا کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کیا کیا؟ اس نے قینچی لی اور اس دنیا کے نقشے کے آٹھ دس ٹکڑے کر دیے اور بچے سے کہا: بیٹا! میں تمہیں ٹیپ بھی دیتا ہوں اور میں تمہیں یہ چند کاغذ دیتا ہوں، اگر تم ان کو ترتیب سے جوڑ کر لاؤ گے تو میں تمہاری پسند کی ونیلا آئس کریم تمہیں لے کر

دوں گا۔ وہ بچہ تھا اس لیے ونیلا آئس کریم کا نام سن کر خوش ہو گیا۔ چنانچہ وہ ٹیپ اور کاغذ کے ٹکڑے لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اب انجینئر صاحب نے سکھ کا سانس لیا کہ اب یہ دو گھنٹے وہیں مصروف رہے گا اور میں اپنا کام نکال لوں گا۔

ابھی پانچ منٹ نہیں گزرے تھے کہ بچہ واپس آیا اور کہنے لگا: ابو جی! میں نے اپنا کام کر لیا ہے، آپ دیکھیں۔ جب اس نے وہ کاغذ لے کر اپنے سامنے رکھا تو بڑا حیران ہوا کہ سمندر سے سمندر ٹھیک ملے ہوئے ہیں، پہاڑوں سے پہاڑ ٹھیک ملے ہوئے ہیں، ملکوں کی حدود بالکل اپنی جگہ پر تھیں، اور اس بچے نے بالکل ٹھیک سب چیزوں کو جوڑ دیا۔ وہ حیران ہو گیا کہ اگر میں انجینئر بھی جوڑنے بیٹھتا تو مجھے بھی اتنا وقت لگتا اور بچے نے تو کمال کر دیا کہ پانچ منٹوں میں جوڑ کر لے آیا۔ چنانچہ وہ حیران ہو کر بچے سے پوچھنے لگا: بیٹا! تم نے اتنا جلدی یہ نقشہ کیسے جوڑ لیا؟ تو بچے نے مسکرا کر اس کاغذ کو الٹا کر دیا۔ جب اس نے الٹا کر کے رکھا تو اس نے دیکھا کہ دوسری طرف ایک عورت کی بڑی سی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بچے نے وہ تصویر جوڑی اور دوسری طرف سے دنیا کا نقشہ خود بخود جڑ گیا۔

تو بھئی! ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ ہماری نظر میں دنیا کا نقشہ جوڑنے کی طرح مصیبت ہو اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے بندے کے سامنے اس تصویر کو جوڑنے کی طرح بہت آسان ہو۔ اس لیے غصے میں آنے یا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ جو بندہ اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے اس کی زندگی کے اندر خوشیاں آ جاتی ہیں۔

کامیاب زندگی کا راز:

ایک اصول یاد رکھیے!...... کہ کامیاب زندگی گزارنے والے لوگ عام طور پر مثبت سوچ والے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ایک دفعہ ورلڈ بک آف ریکارڈ پڑھ رہا تھا۔

اس میں انہوں نے ایک جگہ بہت عجیب بات لکھی۔ انہوں نے لکھا کہ ''دنیا میں جتنے لوگوں نے ریکارڈ قائم کیے یا تاریخ میں انہوں نے کوئی نمایاں کام کر کے دکھائے، ہم نے ایسے سینکڑوں لوگوں سے انٹرویو لیے اور ہم نے ان میں ایک چیز مشترک دیکھی کہ جس جس بندے نے انٹرویو دیا اس نے کہا کہ مقابلے سے پہلے مجھے پکا یقین تھا کہ میں جیت جاؤں گا، اور میں جیت گیا۔''

انہوں نے لکھا کہ ہمیں ایک بندہ بھی ایسا نہیں ملا کہ جس نے کہا ہو کہ مقابلے سے پہلے میں ڈر رہا تھا کہ میں ہار جاؤں گا مگر میں جیت گیا۔ تو معلوم ہوا کہ مقابلے میں وہی لوگ جیتتے ہیں جن کے اندر مثبت سوچ ہوتی ہے اور جیتنے کا شوق سمایا ہوتا ہے۔

God helps those who help themselves.

''خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں''

اس لیے اگر ہم بھی مثبت سوچ رکھ کر اپنے زندگی کے کاموں کو سنوارنے کی کوشش کریں گے تو ہم بھی ان مسائل کو بڑے آرام سے ختم کر دیں گے اور ہم بڑی پر سکون زندگی گزارنے والے بن جائیں گے۔

کینسر کے مریض کی قوتِ ارادی:

اٹلی کا رہنے والا ایک آدمی تھا۔ اس نے عربی زبان سیکھی۔ اس کو ہربل میڈیسن کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ عربی زبان سیکھنے کے بعد وہ ایک لائبریری میں گیا۔ اسے وہاں پر عربوں کی یونانی حکمت کی کتابیں مل گئیں۔ اس نے چند کتابوں کا اطالوی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ جب ترجمہ ہوا تو لوگوں نے اس کی کتاب ہاتھوں ہاتھ خرید لی۔ پورے ملک میں اس کی شہرت ہوگئی کہ اس نے کتنا اچھا کام کیا کہ اس نے ایسا علم ایک زبان

سے دوسری زبان میں منتقل کر دیا۔

جب ہر طرف اس کی تعریفیں ہو رہی تھیں تو اس بندے کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کے پاس تشخیص کے لیے گیا تو ڈاکٹر نے تشخیص کی کہ آپ کو کینسر ہے اور یہ کینسر اتنا پھیل چکا ہے کہ ہمارے خیال میں دو سال کے اندر آپ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک پہنچ جائیں گے، اس سے زیادہ آپ زندہ نہیں رہ سکتے۔

جب ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کی زندگی اب دو سال باقی ہے، بیماری بڑھ جائے گی اور علاج نہیں ہو سکے گا تو اس بندے نے سوچا کہ مجھے اتنے تھوڑے وقت میں بہت سارے کام کرنے ہیں۔ لہٰذا مجھے پریشان ہونے کی بجائے زیادہ کام کرنا چاہیے۔

چنانچہ وہ کینسر کا مریض لائبریریوں میں گیا اور اس نے یونانی حکمت کی عربی کتابیں ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ بالآخر اس نے اسی (۸۰) کتابیں ڈھونڈ نکالیں جو عربی زبان میں تھیں اور اطالوی زبان میں ان کا ترجمہ کیا جانا بہتر تھا۔ پھر اس نے اپنے ساتھ ترجمہ کرنے والوں کی ایک ٹیم بنالی۔ ان سے اس نے کہا کہ جو اصطلاحات ہیں ان کا ترجمہ میں کروں گا اور جو سیدھے سیدھے فقرے ہیں ان کا ترجمہ آپ کرتے جائیں۔ اس طرح اس کا کام تیز ہو گیا۔ اندازہ لگائیے کہ اس بندے نے دو سالوں میں اسی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان سے اطالوی زبان میں کر دیا اور ورلڈ بک آف ریکارڈ میں اس بندے کا نام لکھا گیا۔

آٹو میٹک سلائی مشین کی ایجاد:

میں ایک سائنس دان کے حالاتِ زندگی پڑھ رہا تھا۔ وہ کپڑے کی سلائی مشین بنانا چاہتا تھا...... کپڑے کی سلائی عورتیں اپنے ہاتھ سے سوئی دھاگے سے کر لیتی ہیں...... جس سوئی کے ساتھ ہاتھوں سے سلائی کی جاتی ہے اس کے سرے پر بالکل

نوک بنی ہوتی ہے اور پیچھے دھاگہ ڈالنے کے لیے سوراخ ہوتا ہے۔ اس سے عورتیں ہاتھ سے کپڑے سی لیتی ہیں...... اس نے اس کے لیے ایک آٹو میٹک مشین ڈیزائن کی۔

مشین تو ٹھیک ڈیزائن ہوگئی۔ مگر مسئلہ یہ بنا کہ جب وہ سوئی کو فٹ کرتا تو وہ ایک ہی لمحے میں ٹوٹ جاتی۔ جیسے ہی مشین چلتی تو سوئی ٹوٹ جاتی۔ وہ بڑا پریشان ہوا۔ اس نے مختلف قسم کے میٹریل آزمائے مگر کوئی کام بنتا نہیں تھا۔...... اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو تھک ہار کے بیٹھ جاتا کہ کوئی سوئی کامیاب نہیں ہورہی..... مگر اس کو اتنی سمجھ تھی کہ اگر ایک صورت میں کام نہیں بن رہا تو کسی دوسرے آپشن کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے سوچنا شروع کر دیا۔

اس کے ذہن میں آیا کہ اس سوئی کا سوراخ اس کے سرے پر کیوں بنا ہوا ہے، میں اس کو ٹپ کے اوپر کیوں نہ بناؤں۔ اس خیال کے آنے کے بعد اس نے ایک نئی سوئی بنائی اور اس کا سوراخ اس نے ٹپ کے قریب بنا دیا۔ پھر اس نے اسے مشین میں فٹ کیا تو مشین نے چلنا شروع کر دیا اور وہ آٹو میٹک مشین بنانے کا موجد بن گیا۔ تو معلوم ہوا کہ ہمیں بھی اپنی زندگی میں مسائل کو ذرا متبادل طریقے سے حل کر لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی طرح اس مسئلے کو ضرور حل کر دیتے ہیں۔

مثبت سوچ پُرامید رکھتی ہے:

مثبت سوچ سے انسان کے اندر امید پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پرامید ہوتا ہے کہ میں یہ کام کر جاؤں گا، میرا اللہ میری مدد کرے گا۔ اور دنیا امید کے اوپر قائم ہے۔ اور جن لوگوں کی منفی سوچ ہوتی ہے ان کے اندر اکثر گھبراہٹ اور ڈپریشن ہوتا ہے۔ انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ شریعت نے ایسی منفی سوچ سے منع کیا ہے کیونکہ یہ منفی سوچ

انسان کو مایوس کرتی ہے، اور شریعت نے مایوسی کو کفار کا شیوہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَلَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾

چنانچہ مومن کو ہمیشہ پُر امید رہنا چاہیے۔ جب ہم پر امید ہو کر زندگی گزاریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ کامیابی کے لیے راستہ بھی کھول دیں گے۔ حدیث قدسی میں ہے:

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ

''میں بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔''

اگر بندے کا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہوگا تو اللہ تعالیٰ اچھا معاملہ کریں گے اور اگر بدگمانی ہوگی تو ویسا ہی معاملہ ہوگا۔ اس لیے سوچ ہمیشہ اچھی رکھنی چاہیے۔

مثبت سوچ سے دشمن پر فتح:

بائبل کے اندر ایک واقعہ ہے کہ طالوت علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے۔۔۔۔۔ اس واقعہ کا اشارہ قرآن مجید کے اندر بھی ہے۔۔۔۔۔ مگر بائبل کے اندر اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ ان کا مقابلہ جالوت کے ساتھ ہوا۔

جالوت ایک بڑا لحیم شحیم انسان تھا اور بہت جنگ جو قسم کا بندہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ظالم انسان بھی تھا۔ طالوت علیہ السلام اس کے مقابلے میں آئے۔ طالوت علیہ السلام کے ساتھ تھوڑے سے بندے تھے اور جالوت کے ساتھ زیادہ بندے تھے۔ اور طالوت علیہ السلام ضعیف العمر بھی ہو چکے تھے۔

بندے کی جیسی عمر ہوتی ہے اس کی آبزرویشن بھی ویسی ہوتی ہے۔ جب طالوت علیہ السلام نے جالوت کو دیکھا تو انہیں وہ لحیم وشحیم نظر آیا۔ چنانچہ بائبل کے الفاظ ہیں کہ انہوں نے اسے دیکھتے ہی کہا:

It is very difficult to kill him, because he is very big.

''اسے مارنا تو بہت مشکل ہے کیونکہ یہ تو بہت بڑا ہے۔''

اس وقت ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جس کا نام داؤد علیہ السلام تھا۔

اس نوجوان نے جب جالوت کو دیکھا تو دیکھتے ہی مسکرایا اور کہنے لگا:

It is very easy to kill him, because he is very big. I will never miss him.

''اسے مارنا تو بہت آسان ہے کیونکہ یہ تو اتنا بڑا ہے، میرا نشانہ کبھی خطا ہو ہی نہیں سکتا۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ داؤد علیہ السلام نے اس پر ایک پتھر پھینکا جو اس کے ماتھے پر لگا اور وہیں اس کو موت آ گئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے طالوت علیہ السلام کو فتح عطا فرما دی۔ سچی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر امید اور مثبت سوچ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے لیے راستے بھی کھول دیا کرتے ہیں۔

نقصان کو نفع میں بدلنے کی صلاحیت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی خوبیاں دی ہیں کہ یہ اپنے Minus (نقصان) کو اپنا Plus (نفع) بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی انسان ہو، وہ اپنی قوت ارادی کو استعمال کر کے نقصان سے بچ سکتا ہے۔ اگر ہم بھی آج تک منفی سوچ کی زندگی گزارتے رہے ہیں تو آج ہم مثبت سوچ والی زندگی گزارنے کی نیت کر لیں۔ پھر ہم اپنی آنکھوں سے اس کی برکتیں دیکھیں گے۔

دلوں کی دنیا میں انقلاب:

حضرت گنج بخش لاہور کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ انہی کی وجہ سے

اس علاقے میں دین آیا۔ ان کا نام حضرت علی ہجویری تھا۔ ان کے بارے میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے کہا: ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہ نما

ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی روحانیت بخشی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت علی ہجویری نے کسی دریا کو عبور کرنا تھا...... دریائے سندھ جیسے بڑھے دریا کو عبور کرنے میں کوئی آدھا پونہ گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ کیونکہ آدمی دریا کو بالکل سیدھا کراس نہیں کر سکتا، بلکہ ذرا اپ سٹریم جا کر دور سے وہ کشتی چلاتے ہیں اور چونکہ اوپر سے ہوا کا دباؤ بھی ہوتا ہے اس لیے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے ترچھا کراس کیا جاتا ہے...... حضرت کشتی پر بیٹھ گئے اور سفر شروع کر دیا۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ آپ کے سر پر ٹوپی تھی۔ خیال آیا کہ کہیں ٹوپی اڑ کر پانی میں نہ چلی جائے۔ چنانچہ حضرت نے ٹوپی اتار کر جیب میں ڈال لی اور ذکر و مراقبہ میں مشغول ہو گئے۔

حضرت نے ایک دو دن پہلے سر کا حلق کروایا تھا...... ٹنڈ کروانے کو حلق کروانا کہتے ہیں، جب نئی نئی ٹنڈ ہوتی ہے تو بڑی خوش نما نظر آتی ہے...... وہاں کشتی میں ہی قریب سے ایک بچہ گزرا تو اس نے دیکھا کہ اتنا صاف ستھرا ہے۔ چنانچہ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو بڑا ملائم نظر آیا۔ اس نے جا کر دوسرے کو بتا دیا۔ اب دوسرا لڑکا بھی ہاتھ پھیرنے کے لیے آیا۔ اس کو بھی بڑا اچھا لگا۔ اس نے جا کر تیسرے کو بتایا۔ وہ تیسرا ذرا شرارتی قسم کا تھا۔ جب وہ آیا تو اس نے آ کر سر پر ہاتھ بھی پھرا اور ٹھونگا بھی لگا دیا۔ اس پر باقی بچے ہنسنے لگے۔ یہ اللہ کے بندے اللہ کے ذکر میں مست بیٹھے رہے۔ انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ بچے کیا کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے بچے نے تھپڑ

بھی لگا دیا۔

ان بچوں کی بدتمیزی کو دیکھ کر قریب کے مردوں اور عورتوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اب یہ شغل بن گیا کہ بچہ آتا اور ان کے سر پر تھپڑ لگاتا اور ساری کشتی کے لوگ ہنسنے لگتے۔ ان کے لیے مذاق بن گیا۔ جب کشتی والوں نے مذاق اڑایا تو پھر اللہ تعالیٰ کو اپنے پیارے بندے کا مذاق اڑانے پر جلال آ گیا۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:

مَنْ عَادَلِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ

''جو میرے ولی سے دشمنی کرتا ہے میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔''

چنانچہ جب انہوں نے یہ بدتمیزی کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت گنج بخش کے دل میں الہام فرمایا کہ ''اے میرے پیارے! یہ اتنی بدتمیزی کر رہے ہیں، آپ کی شان میں گستاخیاں کر رہے ہیں اور آپ کا اتنا صبر کہ آپ اس کو برداشت کر کے بیٹھے ہوئے ہیں، اگر آپ بددعا کریں تو میں اس پوری کشتی کو ہی الٹ دیتا ہوں۔''

کہتے ہیں کہ جیسے ہی ان کے دل میں یہ الہام ہوا تو حضرت نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی:

''اے اللہ! اگر آپ کشتی الٹنا ہی چاہتے ہیں تو ان سب لوگوں کے دلوں کی کشتی کو الٹ دیجیے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی۔ کہتے ہیں کہ اس کشتی میں جتنے مرد اور عورتیں تھیں، ان میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے موت سے پہلے ولایت کا نور عطا فرما دیا۔ یہ ہوتی ہے مثبت سوچ۔ اللہ والوں کی ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ ایسے حالات میں بھی ان کی زبان سے بددعا نہیں نکلتی، بلکہ ان کی زبان سے دعائیں نکل رہی ہوتی ہیں۔

نبیِ رحمت ﷺ کی رحمت بھری سوچ:

اللہ کے پیارے حبیب ﷺ تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ مثبت سوچ رکھنے والے تھے۔ نبی علیہ السلام طائف میں تشریف لے گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے کس قدر برا سلوک کیا! بچوں نے پتھر پھینکے اور آپ ﷺ کے قدمین مبارک سے خون نکلا اور نعلین مبارک خون سے بھر گئے۔ نبی علیہ السلام بہت تھکے ہوئے تھے۔ بھوک بھی تھی، پیاس بھی تھی۔ بہت پریشانی کے عالم میں اس بستی سے نکلے اور عتبہ اور شیبہ کے انگور کے سامنے آکر بیٹھے۔ وہاں آپ ﷺ نے دعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّۃَ حِیلَتِیْ وَ ھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی بَعِیْدٌ یَتَجَھَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ وَ لٰکِنْ عَافِیَتُکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمَاتُ وَ صَلُحَ عَلَیْہِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَکَ اَوْ یَحُلَّ عَلَیَّ سَخَطُکَ لَکَ الْعُقْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ

اے اللہ! تجھی سے شکایت کرتا ہوں میں اپنی کمزوری اور بے کسی کی، اور لوگوں میں ذلت ورسوائی کی۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی ضعفاء کا رب ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ کسی اجنبی بیگانے کے جو مجھے دیکھ کر ترش رو ہوتا ہے اور منہ چڑھاتا ہے یا کسی دشمن کے جس کو تو نے مجھ پر قابو دے دیا ہے۔ اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی کی بھی پروا نہیں، تیری حفاظت مجھے کافی ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور

کے طفیل جس سے تمام اندھیریاں روشن ہوگئیں اور جس سے دنیا و آخرت کے
سارے کام درست ہو جاتے ہیں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا
غصہ ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو، تیری ناراضگی کا اس وقت تک دور کرنا ضروری
ہے جب تک تو راضی نہ ہو، نہ تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت۔

یہ ایسی پیاری دعا ہے کہ بڑا پریشان بندہ بھی اگر اس دعا کو مانگے تو اس میں اتنی برکت ہے کہ اس دعا کو مانگنے سے اللہ تعالیٰ اس بندے کے دل کو تسلی دے دیتے ہیں۔ یہ ہمارا تجربہ ہے۔

جب نبی علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرئیل علیہ السلام پہاڑوں کے انتظام والے فرشتے میکائیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر آئے۔ جبرئیل نے آ کر عرض کیا کہ میں فلاں فرشتے کو ساتھ لایا ہوں ان لوگوں نے آپ کے ساتھ اس قدر برا سلوک کیا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو دو پہاڑوں کو آپس میں ملا کر پوری کی پوری بستی کو ہی ختم کر دیا جائے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ ان لوگوں نے نبی علیہ السلام سے کیا سلوک کیا تھا اور ایسے سلوک کے بعد بندے کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے، مگر اللہ کے محبوب ﷺ اللہ کے محبوب تھے۔ اس نبیِ رحمت نے فرمایا کہ نہیں، میں نہیں چاہتا کہ ایسا عمل کیا جائے۔ پوچھا: آخر کیوں؟ فرمایا: یہ لوگ مجھے نہیں پہچان سکے تو میں امید کرتا ہوں کہ ان کی اولادوں میں سے اللہ ایسے لوگوں کو پیدا کر دے گا جو مجھے پہچانیں گے اور مجھ پر ایمان لانے والے بن جائیں گے۔ قربان جائیں اس مثبت سوچ پر۔

جو عاصی کو کملی میں اپنی چھپا لے جو دشمن کو بھی زخم کھا کر دعا دے
اسے اور کیا نام دے گا زمانہ وہ رحمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

اللہ رب العزت نبی علیہ السلام کی رحمۃ للعالمینی کا کچھ تھوڑا سا رنگ ہمیں بھی عطا

فرما دے۔ ہمارے اندر بھی مثبت سوچ آجائے اور ہماری زندگی بھی کامیاب بن جائے۔

سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(الاحزاب:۲۱)

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

بہترین طریقۂ زندگی

بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

دامت برکاتہم

اقتباس

''جس کام کو نبی اکرم ﷺ نے جس طریقے سے کیا، اس کام کو کرنے کا اس سے بہتر طریقہ دنیا میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔''

یہ ہمارا ایک دعویٰ سمجھ لیجیے یا نتیجہ۔ مگر ہمارا نتیجہ اتنا ٹھوس ہے کہ اس بات کو کرتے ہوئے گویا ہمارے پاؤں کے نیچے چٹان ہے۔ یعنی ہم اتنے یقین سے یہ بات کر رہے ہیں۔ جس طرح ایک انجینیئر کے سامنے دو ضرب دو کہا جائے تو وہ چار جواب دے گا۔ یہ جواب دیتے ہوئے اسے پکا یقین ہوتا ہے کہ اس جواب کے علاوہ کوئی دوسرا جواب ہے ہی نہیں۔ بالکل اسی طرح جب ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے دنیا میں جس کام کو جس طریقے سے کیا اس کام کو کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ممکن ہی نہیں،

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم......بہترین طریقہ زندگی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ ۝﴾
......وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی مَقَامٍ آخَرَ......
﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ﴾(الاحزاب:۲۱)
﴿ مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ﴾(النساء:۸۰)
......وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی مَقَامٍ آخَرَ......
﴿وَ مَنْ یُطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا ۝﴾
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۝
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

ثنا خوانوں میں نام لکھوانے کی تمنا:

محسن انسانیت سرور کونین سید الاولین و الآخرین رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ کی مبارک زندگی ہمارے لیے نمونہ ہے۔ اگر انسان دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہے تو وہ آپ ﷺ کے اخلاق عظیم کو اور عادات مبارکہ کو اس طرح اپنائے کہ اس کا ظاہر و باطن نبی علیہ السلام کی تعلیمات کے مطابق بن جائے۔ آپ ﷺ کی مبارک زندگی اتنی کامل ہے کہ وہ ہر زاویے سے مکمل نظر آتی ہے۔ سیرت کے عنوان پر اس امت کے علما نے بہت کام کیا۔ ہر ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی

ور نبی علیہ السلام کے ثناخوانوں میں اپنا نام لکھوایا۔ عاجز بھی اس جماعت میں شامل نے کا متمنی بن کر آیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نبی علیہ السلام کی مبارک زندگی کو اتنا ل کر بیان کیا جائے کہ بھٹکی ہوئی انسانیت اپنی منزل پر پہنچے اور ہدایت کے نور ے نصیب ہو سکے۔

مرا قائد ہے وہ ، زندگی پیغام تھا جس کا
محمد نام تھا جس کا ، محبت کام تھا جس کا
وہ رفتہ رفتہ جس نے قوم کو منزل عطا کر دی
کلی آغاز تھا جس کا، چمن انجام تھا جس کا

مشاہیرِ عالم کی نامکمل زندگیاں:

جب ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جتنے مشاہیر آئے، ان میں سے کوئی فاتح بنا، کوئی سائنسدان بنا، کوئی مختلف چیزوں کا موجد بنا اور انہوں نے زندگی میں بہت کام کیے۔ لیکن ایک عجیب بات ان میں مشترک نظر آتی ہے کہ خود انہوں نے اپنی زبان سے یا ان کے جانے کے بعد دوسرے لوگوں نے یہ بات کہی کہ فلاں نے تو بہت اچھا کام کیا، اگر اس کو اور وقت مل جاتا تو وہ اس کام کو اور بہتر طریقے سے کرتا۔ گویا کہ اپنی زندگی کے نامکمل ہونے کی گواہی اس نے خود اپنی زبان سے دی، یا لوگوں نے اس کی تصدیق کر دی، مثال کے طور پر......

⊙...... نیوٹن نے ''لاز آف نیوٹن'' پر اس قدر ٹھوس کام کیا کہ سائنس کی دنیا میں اس کی بہت عرصہ تک اس وجہ سے عزت ہوتی رہی۔ پھر بھی لوگوں نے کہا کہ اگر نیوٹن کو کچھ اور مہلت ملتی تو وہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کام کرتا۔

⊙...... آئن سٹائن کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ سائنس کی دنیا میں آج یورپ اس کی اس طرح عزت کرتا ہے جس طرح دین کے معاملہ میں ہم اپنے پیغمبروں کی عزت کرتے

ہیں۔اس نے تھیوری آف ریلیٹویٹی پیش کی جس کی بنیاد پر انسان نے ایسی ایسی چیزیں بنائیں کہ جس کی وجہ سے اس کا چاند پر قدم ٹکانا آسان ہوگیا۔مگر اس کے بارے میں بھی لوگوں نے یہی لکھا کہ اس کی زندگی نے وفا نہ کی، اگر وہ کچھ دیر اور زندہ رہتا تو اس کے سامنے کئی راز کھلتے۔

⊙ ......ہم نے سمرقند کے اندر تیمور لنگ کا مزار دیکھا۔وہاں کے لوگوں نے اسے اس وقت فاتحِ عالم کے نام سے لکھا تھا۔وہ اپنے وقت میں پوری دنیا کا فاتح سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کے بارے میں بھی یہی لکھا گیا کہ اس نے ان ان ملکوں کو فتح کر لیا، اگر اسے موقع ملتا تو وہ مزید اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا۔

⊙ ......شیکسپیئر کی زندگی پڑھ کر دیکھیے کہ اس نے اپنی زبان میں اپنے حساب سے ایک سے بڑھ کر ایک کتاب لکھی۔لیکن لوگوں نے پھر بھی لکھا کہ اس کو مہلت نہ ملی، ورنہ وہ اس سے بھی بہتر انداز میں کتابیں پیش کرتا۔

گویا جتنے بھی بڑے بڑے لوگ دنیا میں گزرے ان سب کے کام ادھورے رہ گئے، انہوں نے خود اپنے آخری وقت میں تسلیم کیا یا لوگوں نے ان کے بارے میں کہا کہ ان کو اپنا کام مکمل کرنے کی مہلت نہ ملی۔

تاریخِ انسانیت میں کامل و مکمل زندگی:

تاریخِ انسانیت میں ایک ہستی ایسی ہے کہ جس نے اپنی زندگی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد کی موجودگی میں بقائمی ہوش وحواس، لوگوں سے پوچھا کہ اے لوگو! میں جس مقصد کو لے کر اس دنیا میں آیا تھا، میں نے اس مقصد کو پورا کر دیا، کیا تم اس پر گواہی دیتے ہو؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار لوگوں نے بیک زبان ہو کر کہا: اے اللہ کے محبوب ﷺ! آپ نے سچ فرمایا، آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔معلوم ہوا کہ تاریخِ انسانیت میں ایک ہی زندگی ایسی ہے کہ جس کے کامل اور مکمل ہونے کی گواہی

ان کی اپنی زبان سے بھی ملی اور ان کے سامنے جو لوگ تھے ان کی زبان سے بھی ملی۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ آج ہم اس ''نئی روشنی'' کے دور میں زندگی گزارنے والے لوگوں کو اس شخصیت کی زندگی سے روشناس کرائیں تاکہ وہ ادھوری زندگی گزارنے والے لوگوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے اس پوری زندگی گزارنے والی ہستی کی اتباع کریں۔ اسی میں ان کی ذاتی فلاح بھی ہے اور اسی میں پوری انسانیت کی رہنمائی بھی۔ نبی علیہ السلام کی زندگی ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہے۔

ایک نئے زاویے سے سیرتِ نبوی کا مطالعہ:

اس عاجز کا خیال ہے کہ سیرت سٹڈی سنٹر میں بڑے بڑے علماء، مفکر اور علامہ حضرات تشریف لاتے رہتے ہیں اور وہ بڑے بڑے علمی نکات بیان کرتے رہتے ہوں گے۔ یہ عاجز تو ایک چھوٹا سا طالب علم ہے اور سیرت کے میدان میں تو ابھی اس عاجز کا شمار Beginners (مبتدی لوگوں) میں ہوتا ہے۔ البتہ اپنی بساط کے مطابق یہ عاجز سیرت کے عنوان کو ایک نئے زاویے سے کھولنے کی کوشش کرے گا۔

سائنس کا زمانہ ہے۔ گھر گھر میں کمپیوٹر پہنچ رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کمپیوٹر پر بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ سکولوں میں بھی ان کو کمپیوٹر پڑھایا جاتا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔ آرٹی فیشل انٹیلی جنس پر کام ہو رہا ہے۔ سپر کمپیوٹر کے اس دور میں چونکہ ذہن میں سائنسی چیزیں اکثر آتی رہتی ہیں، اس لیے لوگوں کی سوچ ہی ایسی ہوگئی ہے کہ ہر چیز کو سائنسی نکتۂ نظر سے جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔

نبی علیہ السلام کی مبارک زندگی اور آپ کی مبارک سنتیں سائنسی نکتۂ نظر سے ہمیں کیسے معلوم ہوتی ہیں؟...... اس سلسلہ میں عاجز کا ایک Conclusion (نتیجہ) ہے۔ پہلے وہ آپ کے سامنے پیش کر دے گا۔ پھر اس کے بعد اس کی سپورٹ میں چند

باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرے گا۔ امید ہے کہ آپ یہ باتیں ہوش کے کانوں سے، عمل کے جذبے سے سنیں گے اور اپنے دل میں جگہ دیں گے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ ﴾

''اس قرآن میں نصیحت ہے ان کے لیے جن کے سینوں میں دل ہو''

اور جن کے سینوں میں سِل ہو ان کو ان باتوں سے فائدہ نہیں ہوتا۔ طلب لے کے بیٹھیں گے تو ان شاء اللہ یہ باتیں آپ کے لیے Food for thought (فکر انگیز) ہوں گی۔ یہ باتیں سائنس کے طلباء کو اور لکھے پڑھے حضرات کو فائدہ دیں گی۔ لہٰذا آپ میرے ان الفاظ کو توجہ سے سنیں اور پھر اپنے گھروں میں جا کر اس پر سوچیں۔ آپ ان نکات کو سن کر حیران ہوں گے کہ ہم نے تو سنت کو اس انداز سے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس عاجز کے حساب سے تو یہ ایسا عنوان ہے کہ جس پر بیسیوں طلبا وطالبات پی ایچ ڈی اسلامک سٹڈیز کر سکتے ہیں۔

سنتِ نبوی کے دو پہلو:

نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں کے بارے میں دو Phase (درجے) ہیں۔

(1)...... پہلا فیز تو یہ ہے کہ جو انسان نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں پر عمل کرے گا، اللہ رب العزت کی طرف سے اس کی زندگی میں برکتیں ہوں گی۔ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوگا اور آخرت میں بھی کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا،

مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا

''جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تحقیق وہ بہت بڑی کامیابی پانے والا بن جائے گا''

نبی علیہ السلام کے مبارک طریقوں پر عمل کرنا اور آپ کے اخلاق و عادات کو اپنانا، اس کو سنت کی پیروی کہتے ہیں۔ یہ پیروی عبادات میں ہو، معاشرت میں ہو، معیشت میں ہو، انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر، اس میں ہماری کامیابی ہے۔ ایک انداز تو یہ ہے کہ سنت پر عمل کریں گے تو دنیا میں بھی سکون ملے گا اور آخرت میں بھی کامیابی ملے گی، اللہ تعالیٰ کی پشت پناہی ملے گی، روز محشر وہ اللہ رب العزت کے مقبول بندوں میں شمار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کو جنت عطا فرمادیں گے۔ یہ ایک فیز ہے اور یہ سو فیصد سچی اور پکی بات ہے، یہ سو فیصد تسلیم شدہ بات ہے۔ اس عنوان پر آپ کثرت سے گفتگو سنتے رہتے ہیں۔ آج ہماری گفتگو کا عنوان یہ باتیں نہیں ہیں، بلکہ آج ایک اور گوشے پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سنت کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

(2)..... آج کی گفتگو کا عنوان اس کا دوسرا فیز ہے۔ وہ دوسرا فیز یہ ہے کہ

"جس کام کو نبی اکرم ﷺ نے جس طریقے سے کیا، اس کام کو کرنے کا اس سے بہتر طریقہ دنیا میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

یہ ہمارا ایک دعویٰ سمجھ لیجیے یا نتیجہ۔ مگر ہمارا نتیجہ اتنا ٹھوس ہے کہ اس بات کو کرتے ہوئے گویا ہمارے پاؤں کے نیچے چٹان ہے۔ یعنی ہم اتنے یقین سے یہ بات کر رہے ہیں۔ جس طرح ایک انجینیئر کے سامنے دو ضرب دو کہا جائے تو وہ چار جواب دے گا۔ یہ جواب دیتے ہوئے اسے پکا یقین ہوتا ہے کہ اس جواب کے علاوہ کوئی دوسرا جواب ہے ہی نہیں۔ بالکل اسی طرح جب ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے دنیا میں جس کام کو جس طریقے سے کیا اس کام کو کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ممکن ہی نہیں، تو اس بات کو کرتے ہوئے ہمارے پاؤں کے نیچے بھی چٹان ہے۔ اس بات کا ہم ذرا سائنس کی رُو سے جائزہ لیں گے۔ اس کی چند ایک مثالیں

میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

سونے کی چار ممکنہ صورتیں:

انسان روزانہ سوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سونے کی کون سی پوزیشن طبی طور پر زیادہ بہتر ہے؟ دیکھیں! سونے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کی چار ممکنہ صورتیں ہیں:

- ......ایک تو یہ کہ انسان چت سوئے۔ یعنی اس کی کمر بستر پر ہو اور اس کا چہرہ آسمان کی طرف ہو۔
- ......دوسری صورت یہ ہے کہ پَٹ سوئے۔ یعنی چہرہ نیچے بستر کی طرف ہو اور کمر آسمان کی طرف ہو۔
- ......تیسری صورت یہ ہے کہ بائیں طرف کروٹ لے کر سوئے۔
- ......چوتھی صورت یہ ہے کہ دائیں طرف کروٹ لے کر سوئے۔

(۱)......سیدھا سونا:

پہلی صورت یہ ہے کہ انسان چت سوئے۔ طبی طور پر یہ صورت انسان کے لیے نقصان دہ ہے۔......وہ کیسے؟......اگر آپ انسان کی ریڑھ کی ہڈی کی بناوٹ کے بارے میں سوچیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ بالکل سیدھی نہیں ہے، بلکہ خم دار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معدے کے اندر وزن ہوتا ہے اور اس وزن نے بالآخر کسی جگہ اپنا زور ڈالنا ہوتا ہے اور اس مقصد کے لیے کسی ہڈی نے اس کو برداشت کرنا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سپائنل کارڈ (ریڑھ کی ہڈی) بنادی اور معدے کا وزن اس کے اوپر ڈالا گیا۔ اور اس کو سنبھالنے کے لیے اس ریڑھ کی ہڈی کو تھوڑا سا خم دار بنایا گیا۔ چنانچہ یہ پیچھے کندھوں سے سیدھی آتی ہے اور جہاں ہمارا پیٹ ہے وہاں تھوڑا سا آگے کو خم کھا کر پیچھے ہٹتی ہے۔ آپ اپنی کمر پر ہاتھ لگا کر اس کو محسوس بھی کر سکتے

ہیں۔ تو جب آدمی سیدھا سویا ہوتا ہے تو اس کی ریڑھ کی ہڈی کا خم اوپر کی طرف ہوتا ہے اور اس خم کے اوپر اس کے پیٹ کا وزن ہوتا ہے۔ اور ماشاء اللہ کسی کا دس کلو تو کسی کا پچاس کلو۔ اب اتنے وزن نے اس کے اوپر اثر کرنا ہوتا ہے۔ سائنس کا یہ اصول ہے کہ جب بھی کسی خم دار چیز پر کوئی وزن ڈالا جائے گا تو وہ سیدھا ہونے کی کوشش کرے گی۔ وہ وزن سیدھا اس کے دونوں سروں پر منتقل ہوگا اور اس خم کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب ریڑھ کی ہڈی پر پچاس کلو کا وزن ڈالا جائے گا تو وہ حقیقت میں اس کے اوپر والے اور نیچے والے سرے پر اپنا زور ڈالے گا۔ ایسی صورت میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

☆ ..... گردن کے مہرے درمیان سے دباؤ میں آجاتے ہیں اور گردن کے پیچھے انجائنا کا درد شروع ہو جاتا ہے، یا

☆ ..... کمر کے نچلے مہرے درمیان میں سے دباؤ میں آجاتے ہیں اور لو بیک پین (کمر کے نچلے حصے میں درد) ہو جاتی ہے۔

یہ کمر کے نچلے حصے میں درد کیا چیز ہے؟ ریڑھ کی ہڈی کے آخر میں جو چند مہرے ہیں وہ آپس میں دب جاتے ہیں اور ان کے درمیان جو گوشت اور نروز ہیں وہ دب جاتی ہیں، جس کی وجہ سے انسان کو درد ہوتا ہے۔ یہ کیوں دب جاتی ہیں؟ اب بالآخر ڈاکٹروں کو یہ بات ماننا پڑے گی کہ جو لوگ سیدھا سوتے ہیں ان کو گردن کے پیچھے انجائنا کا درد بھی ہوتا ہے یا پھر لو بیک پین زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب وہ یہی وجہ بتاتے ہیں کہ پیٹ کا وزن جو ساری رات ریڑھ کی ہڈی پر پڑا رہتا ہے وہ ان دونوں سروں پر منتقل ہو کر آدمی کو دونوں جگہ پر درد کرتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس طرح سونا انسان کے لیے بہتر نہیں۔

(۲)......الٹا سونا:

سونے کا دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ آدمی پیٹ سوئے۔ اس کو اوندھا سونا کہتے ہیں۔ کہ چہرہ زمین کی طرف ہو اور کمر اوپر کی طرف ہو۔ سونے کا یہ طریقہ بھی طبی طور پر انسان کے لیے نقصان دہ ہے۔

کیونکہ انسان کے معدے کے ساتھ آنتیں ہوتی ہیں، جہاں سے اس کی غذا گزر رہی ہوتی ہے۔ اور وہاں اس کو جسم سے مختلف وٹامنز اور کیمیکلز ملتے ہیں۔ وہ آنتیں دائیں اور بائیں سائیڈ پر ہوتی ہیں۔ ان آنتوں میں خوراک بھری ہوتی ہے اور ہر آنت ایک دوسرے کے ساتھ چربی کی ایک باریک سی جھلی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔...... اگر کسی بکری کو ذبح کیا جائے اور آپ اس کی آنتوں کو دیکھیں تو آپ کو اس کی آنتیں ایک دوسرے کے ساتھ باریک سی جھلی کے ساتھ جڑی ہوئی نظر آئیں گی...... جب انسان الٹا سوتا ہے، یعنی پیٹ کے بل، تو اس کی آنتیں اوپر ہوتی ہیں اور وہ دونوں طرف معلق پوزیشن میں لٹک رہی ہوتی ہیں۔ ان کے اندر وزن بھی ہوتا ہے۔ اور ہم نے ماء شاء اللہ مرغا اور چرغہ کھایا ہوتا ہے۔ ان میں اچھا خاصا وزن بھی ہوتا ہے۔ اب ایسی صورت میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ اگر کسی جگہ سے وہ چربی کمزور ہے تو وہ آنت اوپر سے نیچے گرے گی اور اس میں بل آجائے گا۔ گرہ لگ جائے گی۔ حدیث پاک میں بھی فرمایا گیا ہے کہ الٹا مت سویا کرو، اس طرح الٹا سونے سے ممکن ہے کہ آنتوں میں کوئی گانٹھ پڑ جائے۔ جب یہ گرہ لگ جاتی ہے تو پھر ہسپتالوں میں پہنچ کر لمبا آپریشن کروانا پڑتا ہے۔ آج کل ڈاکٹروں نے اس بات کو بھی کنفرم کر دیا ہے کہ کئی لوگ ایسے آتے ہیں کہ جن کی آنتوں میں الٹا سونے کی وجہ سے گرہ لگ جاتی ہے اور ان کا آپریشن کرنا پڑ جاتا ہے۔ اگر سو بندوں میں سے کسی ایک کا بھی یہ مسئلہ بن جائے تو کہا جائے گا کہ سونے کا یہ طریقہ انسانی صحت کے منافی ہے۔

(۳)......بائیں کروٹ پر سونا:

سونے کی تیسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی بائیں کروٹ پر سوئے۔ جب آدمی بائیں کروٹ پر سوتا ہے تو اس وقت اس کا دل نیچے ہوتا ہے اور باقی سارا سسٹم اوپر ہوتا ہے...... جیسے دو منزلہ عمارت ہے اور پمپ نیچے لگا ہوا ہے۔ جب سپلائی کرنے کا سسٹم اوپر ہوتا ہے تو پمپ انڈر پریشر (دباؤ میں) آجاتا ہے۔ اگر نیچے سپلائی کرنا ہو تو اس کا کوئی ہیڈ نہیں ہوتا۔ اس کے پاس جتنا پانی ہوتا ہے وہ سارا خود بخود نیچے چلا جاتا ہے۔ جب اسے کشش ثقل کے مخالف پمپ کرنا ہوتا ہے تو اس کے اوپر لوڈ پڑتا ہے۔......اب ساری رات اس کا سسٹم اوپر ہوتا ہے اور اس کا دل اس کے نیچے ہوتا ہے۔ اس طرح دل انڈر پریشر (دباؤ میں) کام کر رہا ہوتا ہے۔ سونے کے اس طریقے میں دو خرابیاں ہیں۔

(۱)...... چونکہ انسان کا دل دباؤ میں ہوتا ہے اس لیے اس کی نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ اتنی گہری کہ آپ اس کو الارم لگا کر دیں تو وہ پکی اپلیں نہیں سنے گا۔ آپ اس کو نماز کے لیے جگائیں گے تو وہ بس اوں کرے گا اور پھر سو جائے گا۔ بعد میں آپ اس سے کہیں کہ میں نے آپ کو جگایا تھا۔ وہ کہے گا کہ مجھے تو نہیں پتا کہ جگایا بھی تھا یا نہیں۔ کئی مرتبہ اگر جاگ بھی جاتا ہے تو اس کا دماغ تھوڑی دیر کے لیے پوری طرح کام نہیں کر رہا ہوتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ میں ذرا پانچ منٹ کے لیے بیٹھوں گا۔ فریش (تازہ دم) ہو جاؤں گا، پھر ہوش میں آکر بات کروں گا۔

(۲)...... ایسے لوگ عام طور پر ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں۔ چونکہ دل دباؤ میں ہوتا ہے اس لیے خواب میں دیکھتے ہیں کہ بھینس پیچھے بھاگی چلی آرہی ہے، ایک سانپ ہے جسے میں دیکھ رہا ہوں، فلاں نے مجھے مار ڈالا۔ اور پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے بڑا ڈراؤنا خواب آیا ہے۔ برے خواب دیکھنے والے جتنے بھی

بندے ہوں گے، آپ ان سے پوچھیے کہ آپ کی سونے کی عادت کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم بائیں طرف کروٹ لے کر سوتے ہیں۔ آج میڈیکلی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بائیں طرف سونے کی صورت میں دل دباؤ میں آجانے کی وجہ سے نیند بھی گہری آتی ہے اور برے اور ڈراؤنے خواب بھی زیادہ آتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بائیں طرف سونا انسان کے لیے فائدہ مند نہیں۔

(۴)......دائیں کروٹ سونا:

سونے کی چوتھی ممکنہ صورت یہ ہے کہ انسان اپنی دائیں کروٹ لے کر سوئے۔ اس صورت میں اس کا پورا سسٹم نیچے ہوتا ہے۔ اور دل اوپر ہوتا ہے۔ گویا اب اس صورت میں پمپ اوپر ہوتا ہے اور پمپ کو نیچے سپلائی کرنے کے لیے کیس پریشر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بھی مزے کی بات ہے کہ جب آدمی جاگ رہا ہو تو اس وقت اس کی نبض کی رفتار، جس کا تعلق براہ راست دل سے ہوتا ہے، ستر سے پچھتر ہوتی ہے، لیکن سونے کی حالت میں اس کی نبض کی رفتار بہت کم ہو جاتی ہے۔ گویا گاڑی کی سپیڈ کم ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس پر لوڈ ڈالا جائے تو وہ بند ہی ہونی ہوتی ہے۔ اگر بائیں کروٹ سوئے گا تو یہی حال ہوگا کہ گاڑی کی سپیڈ کم تر ہوگئی اور اوپر لوڈ پڑ گیا، یوں انڈر پریشر رہ کر اوپر خون کی سپلائی کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر ہم دائیں کروٹ پر سوئیں گے تو ایسے میں انسان کی جیسے ہی نبض کی رفتار کم ہوئی اسی حساب سے اس پر لوڈ بھی کم ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ نیند کی حالت میں انسان کا دل تقریباً آف لوڈ کنڈیشن میں جل رہا ہوتا ہے۔ اور پورے جسم کو خون کی مطلوبہ مقدار پہنچا رہا ہوتا ہے۔

سونے کی سب سے بہتر صورت:

اس طرح سونے سے تین فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

(۱)... ایسے بندے کی نیند بہت گہری نہیں ہوتی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا، یا کوئی بات ہوئی یا الارم بجا تو وہ فوراً اٹھ جائے گا۔

(۲)..... ایسے بندے کو ڈراؤنے خواب نہیں آتے۔

(۳)... ایسی پوزیشن میں بندہ تھوڑی دیر کے لیے سوتا ہے لیکن یہ اپنے آپ کو یوں تازہ دم محسوس کرتا ہے جیسے وہ بہت دیر تک سو کر اٹھا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ دس منٹ کی بجائے دو گھنٹے آرام کیا ہے۔

لہٰذا آج میڈیکلی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے لیے سونے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنی دائیں کروٹ پر سوئے، اور یہی میرے محبوب ﷺ کی مبارک سنت ہے۔ آج سائنس اپنی تحقیق کے بعد اس چیز کو ثابت کر چکی ہے۔ معلوم ہوا کہ سائنس بھٹکتی رہتی ہے۔ اور جب کبھی منزل ملتی ہے تو وہ وہی جگہ ہوتی ہے جہاں میرے محبوب ﷺ کے قدموں کے نشانات ہوتے ہیں۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس کام کو نبی علیہ السلام نے جس طریقے سے کیا، اس کام کو کرنے کا اس سے کوئی اور بہتر طریقہ دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

سن باتھ اور جدید سائنسی تحقیقات:

کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ یورپ کے لوگ مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ تم چھٹیاں گھروں میں ہی گزار دیتے ہو، ساحل سمندر پہ کیوں نہیں جاتے؟ ہم پوچھتے تھے، کیوں جائیں؟ کہتے تھے: سورج کی دھوپ میں غسل کرنے کے لیے، سن باتھ لینے کے لیے۔ کیونکہ اس سے مسام کھل جاتے ہیں اور اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ ہم انہیں جواب دیتے تھے کہ ہم یہ کام نہیں کرتے۔ وہ جواب میں کہتے کہ آپ تو دقیانوس قسم کے لوگ ہو اور جدید سائنس سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے۔

کچھ عرصے کے بعد پوری دنیا میں تحقیق کی گئی کہ مختلف بیماریاں کہاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ اس تحقیق سے پتہ چلا کہ پوری دنیا میں جلد کے کینسر کی سب سے زیادہ شرح یورپ میں ہے۔ اب ان کو پریشانی لاحق ہوئی کہ یہاں جلد کے کینسر کی شرح اتنی کیوں ہے؟...... ہمارے ہاں تو جلد کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ پورے شہر میں شاید کوئی ایک ایسا ڈاکٹر ہوتا ہو، ورنہ تو ہوتا ہی کوئی نہیں۔ اور وہاں تو ہر دوسرا چوتھا ڈاکٹر جلد کا اسپیشلسٹ ہے۔...... انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں اس کی اتنی زیادہ شرح کیوں ہے؟ چنانچہ جب اس پر تحقیق کی گئی تو یہ بات سامنے آئی کہ ہمارے جسم پر سورج کی جو دھوپ ڈائریکٹ پڑتی ہے، اس میں الٹرا وائلٹ ریز (بالائے بنفشی شعائی) ہوتی ہیں اور وہ شعائیں جب جلد کے اوپر پڑتی ہیں تو جلد ان کو جذب کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ سے جلد کے ٹشوز کے اندر کینسر کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب یہ تحقیق سامنے آئی تو یورپ میں کہرام مچ گیا۔ چنانچہ کچھ کمپنیوں نے کہا کہ ہم اس کے لیے ایسی چھتریاں بنائیں گے جو ان مضرِ صحت شعاعوں سے انسان کو بچا سکیں گی۔ لہٰذا اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جس بندے نے سن باتھ لینا ہو وہ چھتری استعمال کرے...... ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم کس کس کے ہاتھ میں چھتری پکڑاؤ گے...... اس تحقیق کے بعد ان لوگوں کا ساحل پر جانا مہنگا بھی ہو گیا اور مشکل بھی ہو گیا کہ اپنی حفاظت بھی کرنی پڑتی ہے۔

اب اللہ رب العزت نے ہمیں پوائنٹ دے دیا۔ ہم ان سے بات کرتے ہیں کہ جب ہم کہتے تھے کہ ہم ساحل پر سن باتھ لینے نہیں جاتے تو تم لوگ مذاق کرتے تھے، اب جب سائنس نے بتایا کہ اس سے تمہیں بیماریاں لاحق ہوتی ہیں تو اپنی چھٹیاں وہاں گزارنے کی بجائے کہیں اور جانے کی باتیں سوچتے ہو۔ اس کو کہتے ہیں:

"کھوتی مڑ تر کے بوہڑ ہیٹھ"

یعنی گدھا گھوم پھر کر بالآخر بوہڑ کے درخت کے نیچے ہی آتا ہے۔

یہ سائنس دان بیچارے اس کھوتی کی مانند ہوتے ہیں اور ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، بالآخر اسی درخت کے نیچے پہنچتے ہیں جس درخت پر میرے محبوب ﷺ کی سنتوں کا سایہ ہے۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''جو پانی سورج کی دھوپ کی وجہ سے گرم ہو اس سے تم وضو مت کرو۔''

انسان حیران ہوتا ہے کہ آگ پر پانی گرم کیا جائے تو وضو کرنا جائز ہے، نبی علیہ السلام نے گرم پانی سے وضو کرنے سے منع نہیں فرمایا، لیکن یہ فرمایا کہ جو پانی دھوپ کی وجہ سے گرم ہو، تم اس سے وضو مت کرو۔ انسانی عقل اس کی تہہ تک نہیں پہنچ رہی ہوتی ہے، اس پانی کے اندر الٹرا وائلٹ شعاعوں کا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا جب اسے بندہ اپنے جسم پر استعمال کرتا ہے تو اس پر بھی ان شعاعوں کا اثر پڑتا ہے۔ سوچیے کہ سائنس تو اب یہ بات بتا رہی ہے جبکہ میرے آقا ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہی یہ سمجھا دیا کہ یہ چیزیں تمہارے لیے نقصان دہ ہیں، تم ان کو مت استعمال کرنا۔

موٹاپا کم کرنے میں سائنسی ترجیحات:

نیویارک میں ہمارے ایک دوست ہارٹ اسپشلسٹ ہیں۔ ایک مرتبہ ہم ان کے آفس میں بیٹھے تھے۔ وہاں پر کچھ لٹریچر پڑا ہوا تھا۔ اس لٹریچر پر لکھا ہوا تھا کہ یہ میڈیکل ایسوسی ایشن آف امریکہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یعنی اس میں بالکل پکی اور ماڈرن ریسرچ پر مبنی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ..... میری عادت ہے کہ جو چیز ملے اسے ضرور پڑھتا ہوں۔ اس کا عنوان بڑا دلچسپ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

''آپ اپنے وزن کو کنٹرول کیجیے، آسانی کے ساتھ''

اس کے اندر عجیب ریسرچ لکھی ہوئی تھی۔ یہ لکھا ہوا تھا کہ:

......جو بندہ اپنے اضافی وزن کو کنٹرول کرنا چاہے اور

......وہ ورزش بھی نہیں کر سکتا،

......وہ سلمنگ سنٹر میں بھی نہیں جا سکتا،

......وہ زیادہ کھانے پر قابو نہیں پا سکتا، اور

......وہ ایسی گولیاں بھی استعمال نہیں کر سکتا، تو

......اس کے لیے ایک آسان طریقہ ہے کہ وہ آدمی اپنے کھانے کو خوب چبا چبا کر کھایا کرے۔

جب میں نے یہ بات پڑھی کہ وہ اپنے کھانے کو خوب چبا چبا کر کھایا کرے تو میں نے کہا کہ یہ تو میرے محبوب ﷺ کی سنت ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ ''نبی علیہ السلام جب لقمہ منہ میں لیتے تھے تو اس کو خوب اچھی طرح چبا کر اندر نگلتے تھے۔ پھر اس کے بعد دوسرا لقمہ کھایا کرتے تھے''۔

پیٹ بھرنے کا فیصلہ دماغ کرتا ہے:

پھر اس کے بعد انہوں نے اس کی سائنسی وجہ بھی لکھی کہ جب انسان کھانا کھاتا ہے تو اس کو پتہ چل جاتا ہے کہ میرا پیٹ بھر گیا ہے۔ یہ فیصلہ انسان کا پیٹ نہیں کرتا، بلکہ یہ فیصلہ اس کا دماغ کرتا ہے۔

دماغ یہ فیصلہ کیسے کرتا ہے؟ دماغ کے پاس دو طرف سے سگنلز آتے ہیں۔

☆......ایک سگنل منہ کی طرف سے آتا ہے۔ منہ ایک کرشنگ یونٹ ہے جس میں دانت غذا کو چباتے ہیں۔ جتنی مرتبہ بھی منہ چلتا ہے اس کو گنا جاتا ہے، پھر وہ گنتی دماغ کو پہنچتی ہے کہ اتنی مرتبہ چل چکا ہے۔ دماغ کو سگنل یہ ملتا ہے کہ خوب سیر ہو کر کھا لیا ہے۔

☆......دوسرا سگنل پیٹ کی طرف سے دماغ کو ملتا ہے۔ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ ہمارے پیٹ کی اوپر والی سطح پر کچھ ٹرانس ڈیوسرز ہیں، جو سگنلز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب ہمارے پیٹ میں خوراک جاتی ہے تو پیٹ پھیلتا ہے۔ جب پیٹ پھیلتا ہے تو وہ ٹرانس ڈیوسر اس کے پھیلاؤ کا سگنل دماغ کو پہنچاتا ہے۔ یہ لانگ ایکٹنگ ٹرانس ڈیوسر کہلاتا ہے۔ یعنی یہ فوراً سگنل نہیں دیتا، بلکہ اس کو سگنل پراسس کرنا پڑتا ہے اور اس پراسس کرنے میں اسے تقریباً آٹھ منٹ لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ابھی کوئی چیز منہ میں ڈالیں اور وہ بھی ایک دم ہی ڈالدیں تو آپ کو جو یہ محسوس ہوگا کہ پیٹ کتنا بھرا ہوا ہے، وہ آٹھ منٹ بعد ہی دماغ کو صحیح سگنل پہنچے گا، جس سے آپ کو پتہ چلے گا کہ پیٹ کتنا بھرا ہوا ہے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟ ماشاءاللہ، جب دستر خوان پر بیٹھتے ہیں تو سوچ لیتے ہیں کہ بس یا ہم نہیں یا یہ نہیں، یعنی خوب کھاتے ہیں اور تھوڑی دیر میں جو کچھ دستر خوان پر ہوتا ہے وہ پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہم جتنا اندر ڈال سکتے ہیں ڈال لیں۔ شروع کے دو چار منٹوں میں ہم ضرورت سے زیادہ کھا رہے ہوتے ہیں اور دماغ کہہ رہا ہوتا ہے کہ ابھی گنجائش ہے۔ حالانکہ گنجائش ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ اور ہم کھاتے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ پھر جب سات آٹھ منٹ گزرتے ہیں تو ہم پھر کہتے ہیں کہ آج بڑا کھالیا۔ یہ ہم کیوں کہتے ہیں کہ آج ہم نے بڑا کھالیا؟ اس لیے کہ اب صحیح سگنل دماغ کو پہنچ رہا ہوتا ہے۔

اس کی ایک آسان سی مثال عرض کر دوں، آپ نے کھانا کھانا شروع کیا۔ بھلے آپ نے پانچ سات لقمے ہی لیے ہیں۔ اس دوران کوئی فون آجائے اور آپ ٹیلی فون سننے چلے جائیں تو آپ پانچ دس منٹ ٹیلی فون سننے کے بعد آتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ اب بھوک ختم ہوگئی ہے۔ ہم اسے کہتے ہیں: جی بھوک مرگئی۔ وہ

بھوک مری نہیں ہوتی بلکہ وہ جو پانچ دس منٹ کا درمیان میں وقفہ ملتا ہے اس میں سگنل پراسس ہو کر دماغ میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اور صحیح انفارمیشن آ چکی ہوتی ہے کہ اب پیٹ بھر چکا ہے۔ اگر ہم آہستہ آہستہ آرام آرام سے چبا چبا کر کھانا شروع کریں تو ہم مناسب سا کھانا کھائیں گے اور ہمارے دماغ میں صحیح سگنل پہنچے گا اور ہمیں محسوس ہو جائے گا کہ ہم نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے۔ اس طرح ہم زیادہ کھانے کی عادت سے بچ جائیں گے اور درمیان سے موٹے نہیں ہوں گے۔ زیادہ کھانے کی وجہ سے ہی جسم میں چربی بڑھتی ہے۔ دراصل جتنی ہمیں ضرورت ہوتی ہے ہم اپنی جلد بازی کی وجہ سے اس سے پانچ یا دس گنا زیادہ کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔

ہمارا منہ ایک کرشنگ یونٹ کی طرح ہے۔ اس میں دانت لقمے کو کرش کرتے ہیں۔ ایک لقمے کو جب بار بار چبائیں گے تو دماغ نے تو دیکھنا ہے کہ کتنا وقت چبانے کا عمل ہوا ہے۔ بھلے آپ ایک ہی لقمے کو چباتے ہیں یا دس لقموں کو۔ تو معلوم ہوا کہ اگر لقمہ منہ میں ڈالیں اور اچھی طرح چبائیں اور اس کے بعد نگلیں، پھر دوسرا لقمہ منہ میں ڈالیں اور چبائیں اور اتنا ہی ٹائم دیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے ہم دس منٹ میں اتنا کھانا کھا لیں کہ ہمارا دماغ مکمل فیصلہ کر سکے کہ ہم نے ضرورت کے مطابق کھا لیا ہے۔ لہٰذا آپ ایک چپاتی کھائیں گے تو آپ کی طبیعت مطمئن ہو جائے گی۔ آپ محسوس کریں گے کہ میرا پیٹ بھر چکا ہے اور میری بھوک مٹ چکی ہے۔ آپ کو گولیاں کھانے اور ڈائٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

معدے کو ڈبل ڈیوٹی نہ دیں:

ایک اور بات یاد رکھیں کہ جب ہم نوالا منہ میں چباتے ہیں اور اندر ڈالتے ہیں تو ہمارے معدے کا کام خوراک کو ہضم کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم لقمے کو پوری طرح چبا کر

معدے میں نہیں بھیجیں گے تو معدہ بوجھ تلے آ جاتا ہے۔ اس صورت میں اسے کرشنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خوراک ہضم بھی کرنی پڑتی ہے۔ گویا اس طرح ہم معدے کو ڈبل ڈیوٹی دے دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معدہ بوجھل ہونے کی وجہ سے خوراک مکمل طور پر کرش نہیں کر پاتا، جس سے صحیح وٹامنز نہیں بنتے اور معدہ ہر چیز کو چربی میں تبدیل کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسا بندہ عام طور پر درمیان سے موٹا ہو جاتا ہے۔ اصل میں پیٹ پر چربی چڑھ جاتی ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ پتا نہیں، ذرا سا کھالیں تو پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ آپ نے سسٹم کو مکمل طور پر استعمال ہی نہیں کیا۔ آپ کرشنگ (خوراک کو پیسنے) کا کام اپنے منہ سے لیا کریں اور ہاضمے کا کام اپنے معدے سے لیا کریں۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جو بندہ اپنا وزن کنٹرول کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اچھی طرح چبا چبا کر تسلی سے کھانا کھائے، تا کہ کھانے میں کچھ وقت لگے اور اس کے پیٹ میں جو خوراک جا چکی ہے اس کا مناسب سگنل دماغ کو پہنچے۔ اگر اس طرح وہ کھائے گا تو اس کے پیٹ میں فالتو چربی نہیں بنے گی۔ ورنہ پیٹ بڑھ جانے کی صورت میں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آپ کو ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح گویا ہم خود مصیبت خریدتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جہاں ہم نبی علیہ السلام کی سنت مبارکہ کو چھوڑتے ہیں وہیں ٹھوکر کھاتے ہیں اور اپنے لیے مصیبت خریدتے ہیں۔ کتنا اچھا ہو کہ ہم ہر کام نبی علیہ السلام کی سنت مبارکہ کے مطابق کریں۔ اس میں دنیا کا بھی فائدہ ہے اور دین کا بھی فائدہ ہے۔

تسلیم کیے بغیر سنتِ نبوی ﷺ پر عمل:

اب یورپ میں لوگ جب کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو وہ تقریباً ایک گھنٹے تک کھانے کا پروگرام بناتے ہیں اور تسلی سے کھاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح انسان تھوڑا کھاتا ہے اور وزن بھی نہیں بڑھتا۔ چنانچہ انہوں نے تسلیم کیے بغیر ہمارے نبی علیہ السلام کی سنتِ مبارکہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ یعنی

''کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ یٹھ''

اس بات کو نوجوان اچھی طرح یاد کر لیں۔

موتیا کا علاج وضو سے:

غور کیجیے! ایک آدمی جب صبح اٹھتا ہے اور فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اسے وضو کرنا پڑتا ہے۔ وہ وضو کرنے کے لیے اپنے منہ پر پانی ڈالتا ہے۔ آج ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آنکھوں کا کالا اور سفید موتیا انسان کی بینائی متاثر کرتا ہے اور اس کو کنٹرول کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان صبح کے وقت آنکھوں میں پانی کے چھینٹے ڈالے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس وقت اوزون ہوتی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر انسان کی آنکھوں میں جاتی ہے۔ اور انسان کی بینائی کو ٹھیک رکھتی ہے۔ جن لوگوں کو فجر کی نماز پڑھنے کی عادت ہے اور وہ وضو کے دوران اپنا چہرہ دھوتے ہیں تو وہ الحمد للہ یہ فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔

مسواک اور جدید سائنسی تحقیقات:

یہ بندہ وضو کے دوران مسواک بھی کرتا ہے۔ اس میں بھی عجیب نکتہ ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے یورپ کے ڈاکٹرز کہتے تھے کہ ہر آدمی صبح اٹھ کر سب سے پہلے دانت صاف کرے، اپنے منہ میں مسواک کرے، برش کرے۔ لیکن مزید

ریسرچ کے بعد اب کہتے ہیں کہ صبح کے وقت مسواک کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی اپنی مرضی ہے البتہ رات سونے سے پہلے مسواک ضرور کیا کریں۔ یعنی صبح کے وقت مسواک کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ انسان رات کو کر کے سوے۔ وجہ کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ انسان کے دانتوں کے اندر کی جگہوں میں بیکٹیریا کی کئی ڈویژن فوج ہوتی ہے۔ دن کے وقت انسان بولتے رہتے ہیں، کھاتے پیتے رہتے ہیں، منہ ہلاتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے بیکٹیریا کو کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جب آدمی رات کو سو جاتا ہے اور منہ بند ہوتا ہے تو جتنی دیر تک وہ سوتا رہتا ہے اس وقت تک بیکٹیریا اس کے دانتوں کو خراب کرتا رہتا ہے۔ اور دانتوں کے درمیان خوراک کے جو ذرات رہ جاتے ہیں وہ ملین کے حساب سے بیکٹیریا بن جاتے ہیں۔ یوں انسان طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ رات کو مسواک کر کے صاف منہ لے کر سونا زیادہ ضروری ہے۔

جب یہ ریسرچ ہم نے پڑھی تو سیدہ عائشہ ؓ کی بات یاد آ گئی۔ وہ فرماتی ہیں کہ نبی علیہ السلام رات کو سونے سے پہلے مسواک فرماتے تھے۔ گویا صاف منہ لے کر نبی علیہ السلام رات کو آرام فرماتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ دن میں ایک مرتبہ نہیں، جتنی مرتبہ نماز کے لیے وضو کرتے تھے اتنی مرتبہ آپ ﷺ مسواک فرماتے تھے۔

گندہ دہنی اور امراضِ شکم:

آج ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انسان کے پیٹ کی زیادہ تر بیماریاں اس کے گندے دانتوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ واقعی جو لوگ مسواک کرنے کے عادی نہیں ہوتے ان کو پیٹ کی کوئی نہ کوئی بیماری ضرور ہوتی ہے۔ لہٰذا جو بندہ بیماریوں سے بچنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے منہ کو صاف رکھے۔ یہ میرے پیارے نبی علیہ السلام کی مبارک سنت ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو سمجھایا جاتا ہے

کہ رات کو سونے سے پہلے ضرور مسواک کریں اور اپنے منہ کو صاف رکھیں۔ تو پہلے کہتے تھے کہ صبح کو مسواک کیا کرو اور اب کہتے ہیں کہ رات کو مسواک کیا کرو۔ گویا بھٹکی ہوئی سائنس ایک مرتبہ پھر جس منزل پر پہنچی۔ وہاں میرے محبوب ﷺ کے قدموں کے نشانات ہیں۔ اور یہ بات ثابت ہوئی کہ:

''کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ ہیٹھ''

گردن کا مسح کرنے میں جسمانی فائدے:

جب بندہ وضو کرتا ہے تو صرف مسواک ہی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ چہرہ بھی دھوتا ہے، اپنے ناک میں بھی پانی ڈالتا ہے، کلی بھی کرتا ہے اور اپنے کانوں کا مسح بھی کرتا ہے۔ دن میں کتنی مرتبہ؟ پانچ مرتبہ۔

انسان کی گردن والے حصے میں سارے الیکٹرانکس ہیں۔ دماغ کی ساری نروز ایک بنڈل کی شکل میں گردن کے پچھلے حصے سے ہو کر ریڑھ کی ہڈی میں اور پھر وہاں سے پورے جسم میں جا رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ گردن کا پچھلا حصہ بہت ہی اہم اور حساس حصہ ہے۔ اگر کوئی بندہ اس حصے کو خشک رکھے تو اس خشکی کی وجہ سے بسا اوقات اس جگہ پٹھوں میں تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس تناؤ کی وجہ سے اس کی نروز پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر کہتے ہیں کہ دن میں ایک دو مرتبہ نہایا کرو۔...... اللہ اکبر!...... انہوں نے پانی لگانے کا تو اب سوچا اور ہمیں وضو میں دن میں پانچ مرتبہ یہاں پانی لگانے کا طریقہ نبی علیہ السلام نے بتا دیا۔ تو وہ اب یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ کو خشک نہ ہونے دو۔ معلوم ہوا کہ

''کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ ہیٹھ''

اس لیے کہ اس کے سوا اس کو کہیں پناہ ہی نہیں ملتی۔

اعضائے وضو دھونے میں ہمارے فائدے:

اچھا! یہ بتائیں کہ ایک آدمی بڑا ہی لکھا پڑھا ہو، وہ ایک دن میں کتنی مرتبہ نہا لے گا؟ وہ دفتر جاتے ہوئے ایک مرتبہ ہی نہائے گا۔ لیکن انسان کے جسم کے کچھ اعضا ایسے ہیں جو عام طور پر کام کرتے ہوئے ننگے رہتے ہیں۔ مثلاً:

- ...... چہرہ ننگا ہوتا ہے۔
- ...... ہاتھ کہنیوں تک ننگے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آدمی کام کر رہا ہوتا ہے۔ مستری کام کرتے وقت اپنی آستین اوپر چڑھا لیتا ہے۔ اس کا کام ہی ایسا ہے۔
- ...... پاؤں ٹخنوں تک ننگے رہ سکتے ہیں۔
- ...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کام کرتے وقت اس کا سر بھی ننگا ہو۔

یہ وہ جگہیں ہیں جن کو عام طور پر کام کے دوران ننگا رکھنا پڑ سکتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے انہی کھلا رہنے والی جگہوں کو دن میں پانچ مرتبہ دھونے کا حکم عطا کیا گیا۔ فضا میں جتنا پلازما اور جتنے جراثیم ہیں وہ ننگے بدن پر ہی لگ سکتے ہیں۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ وضو کے وقت ہمیں پتا بھی نہیں ہوتا اور کئی جگہوں سے آلودگی صاف ہو رہی ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ کام کرنے والوں میں کوئی ٹی بی کا مریض ہوتا ہے، کوئی السر کا مریض ہوتا ہے اور کسی کے منہ سے بیکٹیریا کے اثرات نکلتے ہیں اور ہمیں پتہ ہی نہیں ہوتا، اور وہ ہمارے جسم کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ اگر اس جلد کو ہم دن میں صرف ایک مرتبہ دھوتے ہیں تو یہ اتنا زیادہ محفوظ طریقہ نہیں جتنا دن میں اس کو پانچ مرتبہ دھونا ہے۔ Most heigenic way of living (حفظانِ صحت کا سب سے بہتر طریقہ) یہ ہے کہ آپ ان ننگے رہنے والے اعضاء کو دن میں پانچ مرتبہ دھوئیں۔ فائدہ کس کو ہوا؟ بندے کو ہوا۔ اور سنت کس کی پوری ہوئی؟ نبی علیہ السلام کی سنت پوری ہوئی۔

وضو کرنے میں شوگر کے مریضوں کا فائدہ:

ہمارے ایک دوست شوگر کے مریض تھے۔ ان کو ڈاکٹر ہدایت دے رہا تھا کہ آپ اپنے پاؤں کو دن میں چند مرتبہ مساج کروایا کریں...... اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پاؤں کے اندر خون کی جو نالیاں جا رہی ہوتی ہیں وہ شوگر کی وجہ سے قدرے تنگ ہو جاتی ہیں اور باریک ٹشوز کے اندر خون نہیں پہنچ پاتا۔ اسی وجہ سے شوگر کے مریض کے پاؤں سن ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ پاؤں کے اوپر زخم نہیں ہونا چاہیے اور ان کو دن میں کئی دفعہ دبوایا کریں۔ اب دبوانا اور زخم کو دیکھنا ہر بندے کو اضافی کام نظر آتا ہے۔ لیکن جو بندہ نمازی ہے اور نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں پر عمل کرتا ہے اس کا یہ کام خود بخود ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ کیسے؟ ہم نے دن میں پانچ مرتبہ پاؤں کو مل مل کر دھونا ہوتا ہے۔ جب مل کے دھو رہے ہوتے ہیں تو خود بخود مساج ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح خون کی اگر کوئی بندش وغیرہ ہو تو وہ خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ اگر ایک کافر شوگر کا مریض ہے تو اس کو تکلف کر کے دن میں کئی مرتبہ مساج کرنا پڑتا ہے اور اگر کسی مسلمان کو یہ عارضہ لاحق ہو جائے تو اس کا دن میں پانچ مرتبہ خود بخود مساج ہو رہا ہوتا ہے۔ بے نمازی لوگ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں کیوں کہ ان کے لیے یہ مشکل ہوتا ہے کہ چار پانچ مرتبہ اپنے پاؤں کو چیک کریں۔ پھر ان کے جسموں کی حساسیت پوری نہیں رہتی۔ لہٰذا اگر زخم بھی آ جاتا ہے تو ان کو پتہ نہیں چلتا۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ پاؤں کئی دنوں سے زخمی ہے۔

جب ہمارے دوست نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر نے یہ ہدایات بھی دی ہیں تو میں نے کہا: اللہ کے بندے! کتنی پیاری بات ہے کہ بجائے اس کے کہ تم دن میں پانچ مرتبہ بیٹھ کر اپنے پاؤں کو ٹٹولو اور چیک کرو، تم پانچ مرتبہ نماز پڑھ لیا کرو، ہر نماز کے وضو میں تمہیں پانچ مرتبہ اپنے پاؤں کو مل مل کر دھونے کا موقع مل جائے گا اور یہی

پاؤں کا مساج ہے۔ کیونکہ وضو کرنے والا اپنے پاؤں کی انگلیوں کو مل مل کے دھو بھی رہا ہوتا ہے اور ان کا خلال بھی کر رہا ہوتا ہے۔ اور جو بندہ وضو میں پانچ مرتبہ دن میں پاؤں دھو رہا ہوتا ہے۔ اسے پاؤں کے زخم کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ جا کر ڈاکٹر کو کہہ دینا کہ تم مریضوں کو سیدھا سیدھا یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم پانچ مرتبہ وضو کیا کرو، تمہیں یہ فائدے خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔

اس نے کہا: میں اپنے ڈاکٹر سے بات کروں گا۔ وہ ڈاکٹر ہندو تھا۔ جب اس نے ڈاکٹر کو وضاحت سے بتایا کہ ہم یوں وضو کرتے ہیں اور اس کا یہ فائدہ ہے تو وہ حیران ہو گیا اور کہنے لگا: اچھا! تمہارا بچہ بھی وضو کرتا ہے اور بوڑھا بھی وضو کرتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ وہ کہنے لگا: یہی بات ہے کہ جو بندہ عملی طور پر مسلمان ہوتا ہے وہ کتنی بیماریوں سے خود بخود بچ رہا ہوتا ہے۔ اگر تم بھی اسی طرح وضو کرتے ہو تو تمہیں روزانہ مساج کرنے کی ضرورت نہیں، تم تو پہلے ہی وضو کے باعث یہ نفع اٹھا رہے ہو۔

ہم نبی علیہ السلام کی مبارک سنت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں اور خود بخود اللہ تعالیٰ ہمیں نقصان دینے والی چیزوں سے بچا رہے ہوتے ہیں۔ آج کفر کی دنیا ان سنتوں میں دنیاوی فائدے ڈھونڈ کر ان کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیا مطلب؟

''کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ ہیٹھ''

ایک نوبل پرائز ونر کی الٹی سوچ:

ایک نوبل پرائز ونر تھا۔ اس سے انٹرویو لیا گیا۔

انٹرویو لینے والوں نے پوچھا: آپ نوبل پرائز ونر کیسے بنے؟

اس نے جواب میں کہا: میں ایک سپیشل ورزش کرتا ہوں۔

انہوں نے پوچھا: کون سی ورزش؟

اس نے کہا: میں دن میں تقریباً پندرہ منٹ الٹا کھڑا ہوتا ہوں۔ یعنی سر نیچے اور ٹانگیں

اوپر کرتا ہوں۔

انہوں نے پوچھا: وہ کیوں؟

اس نے کہا: وجہ یہ ہے کہ عام حالات میں دل نیچے ہوتا ہے اور سر اوپر ہوتا ہے۔ اس صورت میں دل سے نیچے والے اعضا کو خون آسانی سے پہنچ جاتا ہے اور دماغ گویا اوپر کی منزل ہے لہٰذا اس تک خون پہنچنا ذرا مشکل کام ہے۔ دونوں سمتوں میں خون کا پریشر مختلف ہوتا ہے۔ یعنی دماغ کو جتنے پریشر کے ساتھ خون ملنا چاہیے اتنا نہیں ملتا۔ چنانچہ جب میں الٹا کھڑا ہوتا ہوں تو میرا سر نیچے ہوتا ہے اور دل اوپر ہوتا ہے۔ اس طرح میرا سارا خون میرے دماغ میں آ جاتا ہے۔ اس طرح میرے دماغ کے بلین اور ٹریلین خلیوں کے اندر میرا خون پہنچ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا دماغ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ اسی لیے میں نوبل پرائز ونر بن گیا۔

جب میں نے یہ انٹرویو پڑھا تو میں نے کہا: یہ بھی پاگل ہے۔ اگر اس کو دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنے کی عادت ہوتی تو بے چارے کو یہ ورزش نہ کرنی پڑتی۔ پورے دن میں اور کوئی صورت نہیں ہوتی کہ سر نیچے ہو اور انسان کا دل اوپر ہو۔ ہمیشہ دل نیچے اور سر اوپر ہوتا ہے۔ لیکن نماز کے سجدے میں انسان کا سر نیچے اور اس کا دل اوپر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر تھوڑا سا لمبا سجدہ کیا جائے تو آدمی کو اپنے کانوں میں، چہرے میں اور دماغ میں فراوانی کے ساتھ خون پہنچتا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے خون کا فلڈ آ چکا ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ سجدے کی حالت میں انسان کا زیادہ سے زیادہ خون سر اور چہرے میں جا رہا ہوتا ہے اور ایک ایک خلیے کو جا کر تازگی بخش رہا ہوتا ہے۔ اس لیے لمبے سجدے کرنے والوں کے چہروں پر اللہ رب العزت ایک رونق عطا کر دیتے ہیں۔

صلحا کے چہروں پر نور کی ایک سائنسی توجیہ:

مجھے ایک ڈاکٹر ملا۔ وہ کہنے لگا: جی! دینِ اسلام نے کہا ہے کہ صلحا کے چہرے پر

نور ہوتا ہے۔ میں نے کہا: بالکل پکی بات ہے۔ کہنے لگا: کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کیسا نور ہوتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر وہ کہنے لگا: میں ایک میڈیکل ڈاکٹر ہوں اور میں نے یہاں امریکہ میں ڈاکٹری کی ہے اور میں نے اس پر ریسرچ کی ہے کہ اصل میں یہ لوگ لمبے سجدے کرتے ہیں اور ان لمبے سجدوں کی وجہ سے ان کے چہرے پر، دماغ میں اور اوپر والے باقی اعضا میں خون وافر مقدار میں چلا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے چہرے دوسروں کی نسبت زیادہ تازہ نظر آتے ہیں۔ بڑھاپے میں بھی ایسے لگتا ہے جیسے وہ بالکل جوان ہوں۔

اس کے بعد وہ ہنس کر کہنے لگا: جی! میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟ میں نے کہا: بتاؤ۔ کہنے لگا: اگر عورتوں کو پتہ چل جائے کہ لمبے سجدے کرنے سے ہمارے چہرے کتنے تازہ نظر آئیں گے تو بے چاریاں کئی کئی گھنٹے روز ہی سجدے میں گزار دیں اور قیمتی قیمتی کریموں سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ تو پتا چلا کہ

''کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ ہیٹھ''

سر کے کے استعمال میں سائنسی ترجیحات:

پچھلے دنوں کی بات ہے۔ میں نیویارک ٹائمز پڑھ رہا تھا۔ اس میں ایک تین کالم کی خبر لگی ہوئی تھی۔ اور اس پر لکھا ہوا تھا:

Burn your extra fat with the use of vinigar.

''سرکہ استعمال کر کے اپنی اضافی چربی کو ختم کر لیجیے۔''

مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے کہا کہ سرکہ استعمال کرنا تو نبی علیہ السلام کی سنت ہے۔ نبی علیہ السلام کے زمانے میں کوئی دعوت ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں سرکہ موجود نہ ہو۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ''جس گھر میں سرکہ ہوتا ہے اس گھر

میں سالن موجود ہوتا ہے"۔

پھر میں نے پورا مضمون پڑھا۔اس میں لکھا ہوا تھا کہ اگر انسان روزانہ چائے کے ایک چمچ کی مقدار سرکہ استعمال کر لے تو وہ کبھی موٹا نہیں ہوسکتا۔اس کے استعمال کے کئی طریقے ہیں۔مثلاً: پانی میں ڈال کر، یا سالن میں ڈال کر، یا سلاد پر ڈال کر، لیکن اگر سلاد میں ڈال کر کھائیں گے تو کئی لوگوں کے گلے اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔اس لیے سرکہ استعمال کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے کہ آپ آدھا گلاس پانی لیں اور اس میں ایک چمچ سرکہ ملا کر روزانہ پی لیں۔یہ چوبیس گھنٹے میں جتنی بھی اضافی چربی ہوگی اس کو ختم کر دے گا۔

تو جن لوگوں کو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اپنا وزن کم کریں وہ بے چارے ورزش بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی وزن کم نہیں کر پاتے، وہ ڈائٹنگ (فاقہ) بھی کرتے ہیں لیکن پھر بھی وزن کم نہیں کر پاتے۔ان کے لیے آسان اور قدرتی علاج یہ ہے کہ وہ سرکہ استعمال کرنا شروع کر دیں۔مسلمان اس کو استعمال کرنے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔اس خبر کے چھپنے کے بعد امریکی سٹوروں میں سرکہ کی قیمت زیادہ ہوگئی۔ہم نے امریکیوں اور یورپیوں کے دسترخوانوں پر سرکہ استعمال ہوتے دیکھا۔میں نے ایک امریکی سے پوچھا: جی! آپ سرکہ کیوں استعمال کرتے ہیں؟اس نے جواب دیا کہ اس میں بہت فائدے ہیں اس لیے ہم نے اسے اپنی غذا کا حصہ بنالیا ہے۔میں نے اس کے سامنے یہ کہا:

"کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ ہیٹھ"

وہ کہنے لگا: What are you saying?

"آپ کیا کہہ رہے ہیں"

میں نے کہا: دیکھو! میں مسلمان ہوں اور یہ میرے پیارے نبی علیہ السلام کی

سنت ہے۔ چونکہ آپ نے بھی اس پر عمل کیا تو میں نے کہا کہ ہماری تحقیقات میں ایک اور نئی انفارمیشن کا اضافہ ہو گیا۔ وہ کہنے لگا: ہاں! یہ نئی انفارمیشن ہے، تمہیں بھی نوٹ کر لینی چاہیے۔ اللہ اکبر کبیرا!!

زیتون کے تیل سے ہائی کولیسٹرول کا علاج:

کچھ لوگوں کو ہائی کولیسٹرول کا پرابلم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پراٹھا مت کھائیں، انڈہ مت کھائیں۔ لاہور میں ہمارے ایک دوست ڈاکٹر شاہد اویس صاحب ہیں۔ وہ پیتھالوجسٹ ہیں۔ لوگ اپنی ٹیسٹ رپوٹیں کرنے کے لیے ان کی لیبارٹری میں جاتے ہیں۔ وہ مجھے کہنے لگے: حضرت! میں نے سو مریضوں پر ایک تجربہ کیا۔ میرے پاس ہائی کولیسٹرول والے مریض آئے، میں نے ان کا کولیسٹرول لیول چیک کیا اور میں نے اس سب کی دوائیاں چھڑوا دیں اور ان سے کہا: آپ زیتون کا استعمال کرنا شروع کر دیں۔ سالن بھی اس میں بنائیں اور اگر دل چاہے تو پراٹھا بھی اسی کا بنا کر کھائیں۔ اس کے علاوہ سلاد پر بھی زیتون کا تیل ڈالیں۔ حتیٰ کہ دودھ میں بھی زیتون کا استعمال کر سکتے ہیں۔ پھر چالیس دنوں کے بعد آ کر دوبارہ مجھ سے ٹیسٹ کروائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس طرح ایک سو مریضوں کا علاج کیا اور ان سب کا کولیسٹرول لیول 200 سے کم ہو گیا تھا۔

جب انہوں نے یہ بات کہی تو میں بڑا حیران ہوا اور پوچھا: اچھا! اللہ تعالیٰ نے زیتون کے تیل میں یہ خاصیت رکھی ہے! یہ تو مجھے پتہ تھا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے..... ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ ..... جب اللہ تعالیٰ قسم کھا رہے ہیں تو اس میں یقیناً کوئی نا کوئی راز پوشیدہ ہو گا۔

بہر حال! ایسا کیوں ہوا؟ پچھلے دنوں میں نے ایک ریسرچ پیپر پڑھا۔ اس میں اس بات کی وضاحت تھی۔ اس کو میں میڈیکل ٹیکنالوجی استعمال کر کے سمجھانے کی

بجائے اپنی زبان میں آسان بنا کر پیش کرتا ہوں۔

اس ریسرچ رپورٹ میں لکھا ہوا تھا کہ زیتون کے تیل کے سائنسی فارمولے میں ایک کرسی خالی ہے۔اس کرسی کی جگہ بالکل ایسی ہے جیسے بیڈ کولیسٹرول کی ہوتی ہے۔لہٰذا یہ بیڈ کولیسٹرول اس کرسی کی پوزیشن میں جا کر فٹ ہو جاتا ہے۔اور یہ زیتون کا تیل اس کو جسم سے باہر نکال دیتا ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ زیتون کا تیل کولیسٹرول لیول کو کم ہی نہیں کرتا بلکہ بند شریانوں کو کھولنے کا کام بھی کرتا ہے۔لہٰذا اب باہر ملکوں میں دل کے مریضوں کو زیتون کا تیل استعمال کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔لہٰذا اس وقت زیتون کے تیل کا استعمال یورپ کی دنیا میں بہت زیادہ ہے۔کینیڈا میں ایک ریسرچ یہ ہوئی کہ کون سا آئل کتنا استعمال ہوتا ہے؟ انہوں نے ریسرچ رپورٹ میں لکھا تھا کہ اس وقت پورے کینیڈا میں زیتون کے تیل کا استعمال سب سے زیادہ ہے۔کس لیے؟اس لیے کہ انہوں نے دیکھا کہ اگر زیتون کا تیل استعمال کریں گے تو دل کی بند شریانیں بھی کھل جائیں گی اور ہارٹ اٹیک کے مریض کو فائدہ ہو جائے گا۔اس کو کہتے ہیں:

''کھوتی مڑ کے بوہڑ ہیٹھ''

یاد رکھیں! زیتون کا تیل استعمال کرنا سنت بھی ہے۔نبی علیہ السلام زیتون کا تیل خوب استعمال فرمایا کرتے تھے۔

ریسرچ ورک کرنے میں ہماری کمزوری:

ہمارے نوجوانوں کی حالت یہ ہے کہ جب یہ بے چارے سنت پر عمل کرتے ہیں تو چونکہ ان کو سائنسی فوائد کا پتہ نہیں ہوتا اس لیے Down feel (سبکی محسوس) کر رہے ہوتے ہیں۔وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم اس طرح قدامت پرست نظر آئیں گے۔او خدا کے بندو! یہ تو ہماری کمزوری ہے کہ ہم نے ریسرچ ورک نہیں

کیا، اگر ہمارے سکالر اس پر ریسرچ کرتے اور دنیا کو بتاتے کہ نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں میں تمہارا یہ فائدہ ہے تو یہ کفر کی دنیا آج سے کتنا پہلے اسلام قبول کر چکی ہوتی۔ یہ تو ہمارا قصور ہے کہ ہم نے اسلام کے حسن کو اور نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں کو کھولا ہی نہیں۔ ہم نے ایسے سائنس دان پیدا کرنا بند کر دیے جو ایک طرف عالم بھی ہوتے اور دوسری طرف سائنس کی باریکیوں کو سمجھ کر سائنس دانوں کو نبی علیہ السلام کی سنتوں کے فائدوں سے روشناس کرواتے۔ یہ اسی کمزوری کی وجہ سے ہے کہ آج ہمارے نوجوان جب کسی سنت پر عمل کر رہے ہوتے ہیں تو Down feel کر رہے ہوتے ہیں جیسے معاذ اللہ انہوں نے کوئی جرم کر لیا ہے۔ پھر جب ہم ان کو سائنسی طور پر سمجھاتے ہیں کہ اس کے اندر یہ فائدے ہیں تو پھر اللہ رب العزت ان کو ہمت عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اب ہم سنت پر بڑے شوق، جذبے اور یقین کے ساتھ عمل کریں گے کیونکہ ہمارے لیے یہی ایک فائدے کی چیز ہے۔

عجوہ کھجور میں راز کی بات:

ہمارے ایک دوست کا کولیسٹرول لیول ہائی ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ آپ کو کولیسٹرول فوراً کنٹرول کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایسی حد تک پہنچ چکا ہے کہ جہاں کسی وقت بھی ہارٹ اٹیک (دل کا دورہ) ہو سکتا ہے۔ انہوں نے گھبرا کر مجھے فون کیا۔ کہنے لگے: حضرت! میں بڑا پریشان ہوں، مجھے کچھ بتائیے۔ ان کی بات سن کر ایک تو ہم نے ان کو دعائیں دیں اور دوسرا نبی علیہ السلام کی سیرت مبارکہ پر نظر دوڑائی کہ ہمارے لیے یقیناً کہیں نہ کہیں روشنی کا مینار ضرور ہوگا اور ہمیں اس سے رہنمائی مل جائے گی۔ چنانچہ مطالعہ کے دوران نبی علیہ السلام کی مبارک زندگی میں سے ایک ایسا ہی معاملہ سامنے آیا جس سے ہمیں امید کی ایک کرن نظر آئی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ وہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے سینے میں درد اور گھٹن ہوتی ہے۔ یہ سن کر نبی علیہ السلام نے فرمایا: یہ دل کی بیماری ہے۔

اس حدیث کو پڑھ کر پتا چلا کہ دنیا میں سب سے پہلے نبی علیہ السلام نے ہارٹ اٹیک کی تشخیص فرمائی۔ حالانکہ سینے کی گھٹن کے ساتھ دل کا کیا تعلق؟ چودہ سو سال پہلے کس کو پتہ تھا۔ لیکن نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو دل کی بیماری ہے۔

پھر انہوں نے پوچھا: اے اللہ کے نبی ﷺ! اب میں کیا کروں؟ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''تم عجوہ کھجوریں استعمال کرو۔''

انہوں نے وہ کھجوریں استعمال کیں اور ان کی تکلیف دور ہوگئی۔

ہم نے جب یہ حدیث پڑھی تو ہم نے سوچا کہ اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی راز ہوگا۔ کیونکہ کھجور کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے وہ تو کاربوہائیڈریٹس ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لگتا ہے کہ اس کے اندر جو گٹھلی ہے اس کے اندر کوئی خاص نعمت موجود ہے۔ ہمیں اس میں راز کی بات یہ ملی کہ کھجور کی گٹھلیوں کو پیس کر خود کھانا اور اونٹوں کو کھلانا عربوں کی عادت تھی۔ ام سلمی ؓ کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ وہ کھجوروں کی گٹھلیوں کو پیستی تھیں اور اپنے اونٹوں کو کھلایا کرتی تھیں۔ اگر لوگوں کے پاس بھی کھانے کی اور کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی تھی تو وہ بھی گٹھلیوں کو پیس کر کھالیا کرتے تھے۔

چنانچہ ہم نے حاجی صاحب سے کہا کہ ہم آپ کو ایک دوائی بھیج رہے ہیں اسے استعمال کیجیے۔ چنانچہ ہم نے عجوہ کھجور کی چالیس گٹھلیاں لیں اور ان کا ہائیڈرالک پریس کے ذریعے پاؤڈر (سفوف) بنوالیا۔ بعد میں ان کو کیپسولوں میں بھرلیا۔ پھر یہ کیپسول حاجی صاحب کو بھجوا دیے اور ساتھ یہ بھی ہدایت دی کہ آپ ہر کھانے کے بعد صبح دوپہر شام ایک ایک کیپسول استعمال کریں۔ بعد میں اور کیپسول بھی بھر کر بھیجے۔

اللہ کی شان کہ چالیس دن کے بعد جب وہ دوبارہ چیک اپ کروانے کے لیے گئے تو وہ کولیسٹرول جو 300 سے بھی زیادہ تھا تو اس دن اس کی ریڈنگ 185 تھی۔ یہ ریڈنگ جوان اور صحت مند آدمی کے کولیسٹرول کی ہوتی ہے۔ یہ ریڈنگ دیکھ کر ڈاکٹر حیران ہوئے کہ اس کی کوئی اور وجہ ہے؟ چنانچہ انہوں نے فون کیا کہ ڈاکٹر یہ رپورٹ مانتا ہی نہیں۔ میں نے کہا: ان سے کہو کہ وہ دوسرا نمونہ لے لیں۔ اس طرح جب دوسری دفعہ ان کا کولیسٹرول ماپا گیا تو وہ بھی 185 نکلا۔

پھر ہم نے یہ نسخہ اپنے کئی درجن دوستوں کو استعمال کروایا اور سو فیصد لوگوں کو فائدہ ہوا۔ جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے کھجور کی گٹھلیوں میں شفا رکھی ہے۔

نبی رحمت ﷺ کے نام سے رجسٹرڈ ایک لاجواب دوائی:

میرے پاس کراچی میں ایک ڈاکٹر آئے۔ وہ کہنے لگے: حضرت! میں دل کی جسمانی بیماریوں کا تو اسپیشلسٹ ہوں، اب میں دل کی روحانی بیماریوں کا بھی اسپیشلسٹ بننا چاہتا ہوں اس لیے آپ سے بیعت ہونے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے اس کی اس بات پر بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے ان سے کہا: ذرا آپ اپنا تعارف تو کروائیں۔

وہ کہنے لگا: میں نے یو کے سے اسپیشلائزیشن کی۔ پھر میں نے اپنے پیشے میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ میں سعودی عرب کے شاہی خاندان کا ہارٹ اسپیشلسٹ بن گیا۔ میں کنگ عبدالعزیز کے زمانے سے لے کر چھتیس سال تک شاہی خاندان کا اسپیشلسٹ رہا ہوں۔ اب میں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور اب میں نے سوچا ہے کہ کراچی میں غریب لوگوں کے لیے فری ڈسپنسری بناؤں گا اور ان کا علاج کروں گا۔

میں نے کہا: میرے پاس ایک دوائی ہے، آپ اسے استعمال کر کے بتائیں کہ وہ دل کے لیے فائدہ مند ہے یا نہیں۔

میں نے ان کو حاجی صاحب والے کیپسول دے دیے۔

ایک ہفتے بعد آ کر وہ کہنے لگے: حضرت! یہ دوائی رجسٹرڈ کروائی ہے کیا؟

میں نے کہا: نہیں۔

وہ کہنے لگا: حضرت! جلدی سے آپ اسے رجسٹرڈ کروالیں، کیونکہ اگر انسان اس کو دنیا میں سپلائی کرے تو لاکھوں ڈالر کما سکتا ہے۔

میں نے کہا: مجھے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ چودہ سو سال پہلے میرے آقا اور سردار صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر رجسٹرڈ ہو چکی ہے۔ ہمیں یہ نعمت نبی علیہ السلام کی مبارک حدیث سے ملی ہے اور میں یہ چاہوں گا کہ ہمیں ڈالر ملنے کی بجائے میرے محبوب ﷺ کی نسبت سے یہ بات دنیا تک پہنچے کہ محبوب ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے میرے اللہ نے اس میں لوگوں کے لیے بیماریوں کی شفا رکھی ہے۔

تو ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ بھٹکی ہوئی سائنس پھر ایک مرتبہ اپنی منزل پر پہنچی، مگر یہ وہی جگہ ہے جہاں میرے محبوب ﷺ کے قدموں کے نشانات ہیں۔

تیز چلنے کے جسمانی فائدے:

کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر تجویز کیا کرتے تھے کہ جاگنگ کیا کرو۔ اسی لیے جوگر بنائے گئے۔ چنانچہ ہر گھر میں بوٹ پہنچ گئے۔ مردوں نے بھی بوٹ پہننا شروع کر دیے، بچوں نے بھی پہننا شروع کر دیے اور عورتوں نے بھی پہننا شروع کر دیے۔ ہر بندہ کہتا ہے کہ صبح صبح دوڑنا چاہیے، جاگنگ کرنی چاہیے۔ ہم جب بھی یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کرتے، دن ہوتا یا رات، دوپہر ہوتی یا شام، تو کہیں مرد دوڑتا نظر آتا اور کہیں عورت دوڑتی نظر آتی، بچے بھی دوڑتے نظر آتے۔ بے چاروں کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوڑ لگانے والے اچھی ورزش کر رہے

ہیں اور اس کا صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔

پھر چند سالوں کے بعد ڈاکٹروں کے پاس ایسے مریض آنے لگے جن کو بڑی عمر میں پاؤں کی ہڈیوں میں مستقل دردیں رہنے لگیں۔ دوسرے جوڑوں میں بھی دردیں رہنے لگیں۔ ڈاکٹروں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دوڑنے کے عادی ہیں۔ چونکہ دوڑنے کے دوران انسان کا سارا وزن پاؤں کی ہڈیوں پر پڑتا ہے اس لیے ان پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ جوانی میں تو پتہ نہیں چلتا لیکن جیسے ہی آدمی بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے تو پھر دردیں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ ہڈیاں زیادہ گھس گئیں تھیں۔ اصل میں ہڈیوں کے درمیان Lubricating (چکنا رکھنے) کے لیے جو مواد تھا وہ اضافی استعمال ہو گیا۔ لہٰذا اب ڈاکٹروں نے کہنا شروع کر دیا کہ جاگنگ کی بجائے Brisk Walk بہتر ہے۔

یہ Brisk Walk کیا ہے؟ برسک واک ذرا تیز چلنے کو کہتے ہیں۔ نہ بھاگیں اور نہ ہی سستی سے چلیں، ذرا اچھے اور تیز انداز سے چلنا برسک واک کہلاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ریسرچ کے مطابق یہ برسک واک انسان کے لیے سب سے بہتر ورزش ہے۔

ہم نے جب نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں کو دیکھا تو ہمیں یہ مبارک سنت ملی کہ نبی علیہ السلام جب چلتے تھے تو اتنا تیز چلتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے پانی اونچی جگہ سے نیچے کی جگہ پر آ رہا ہے۔ یعنی جیسے آدمی اونچائی سے نیچے کی طرف آئے تو ذرا تیزی سے آتا ہے، نبی علیہ السلام اسی طرح تیز چلتے تھے۔ آج سائنس کی دنیا میں اس کا نام ”Brisk Walk“ رکھ دیا ہے۔ اسے کہتے ہیں:

”کھوتی مڑ تڑ کے بوہڑ یٹھ۔“

ہلکی پھلکی ورزش اور جدید سائنسی تحقیق:

ایک وقت تھا جب کہتے تھے کہ انسان کو صبح سویرے اٹھ کر ورزش کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے لوگوں نے اپنے گھروں میں ورزش مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی ورزش کرتے۔ عورتیں بھی گھروں میں دوڑ لگاتی تھیں۔

لیکن سائنس نے اب کچھ اور کہنا شروع کر دیا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ چوبیس گھنٹے میں سے ایک مرتبہ اگر آپ اپنے جسم کو زیادہ ورزش کروائیں گے تو اس سے زیادہ توانائی ضائع ہوتی ہے، اس سے زیادہ بہتر ہے کہ آپ وقفے وقفے سے ہلکی پھلکی ورزش کریں۔ کیونکہ ورزش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل کی دھڑکن جو عام طور پر 70 ہوتی ہے، وہ ورزش کی وجہ سے بڑھ جائے اور اس کو 120 تک پہنچایا جائے۔ 120 تک محفوظ ہوتی ہے۔ اگر 120 سے بھی اوپر چلی جائے تو پھر انسان پر اس کا مضر اثر ہوسکتا ہے۔ اگر 150 سے اوپر چلی جائے تو اور زیادہ اثر ہوسکتا ہے۔ اور 170-160 پر ہارٹ پرابلم شروع ہوسکتا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اتنی ورزش کی جائے کہ دل کی دھڑکن 120 تک چلی جائے۔

ہمارا دل ایک پمپ کی مانند ہے۔ یہ پمپ خون سپلائی کرتا ہے۔ جب اس کی قوت بڑھ جائے گی، 70 کی بجائے 120 ہو جائے گی تو خون کا بہاؤ بڑھ جائے گا۔ جب خون کا بہاؤ بڑھے گا تو ہمارے جسم کی شریانوں کے اندر اگر کہیں کوئی رکاوٹ ہے تو یہ بہاؤ اس کو بہا کر لے جائے گا اور بالآخر ہمارا سسٹم ٹھیک کام کرے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جیسے پائپ بند ہو جائیں تو اس میں پیچھے سے ذرا پریشر کے ساتھ پانی ڈال دیتے ہیں اور وہ رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہی Fluid mechanic (بہاؤ کا میکنزم) ہمارے جسم میں بھی کام کر رہی ہے۔ تو ہماری شریانوں میں جہاں جہاں رکاوٹ ہوتی ہے، جب ہمارے دل کی دھڑکن 120 ہو

جاتی ہے تو خون کا بہاؤ اتنا ہو جاتا ہے کہ خون کا وہ بہاؤ ساری رکاوٹ کو ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا اتنی ہلکی ورزش کرنی چاہیے کہ آدمی کے دل کی دھڑکن ۱۰۰ تک چلی جائے۔ اور 120 تک تو معمولی سی ورزش سے بھی چلی جاتی ہے۔ اب ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ ایک وقت میں بھاری ورزش کرنے کی بجائے مختلف اوقات میں ہلکی پھلکی ورزش کر کے اپنے جسم کے اندر جو بھی رکاوٹ یا بندش ہے اس کو ختم کر لو، یہ ایک بہتر طریقہ ہے۔

ہمارے ایک دوست جاپان گئے، وہاں کچھ ڈائریکٹرز کے ساتھ ان کی میٹنگ تھی۔ وہ میٹنگ میں ایک دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اب ہم ایکسرسائز کے لیے پانچ منٹ کا وقفہ کریں گے۔ وہ حیران ہوئے۔ دیکھا کہ جاپانی اپنی کرسیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر نیچے کرنے لگے اور انہوں نے ہلکی پھلکی ورزش کر لی۔ اور اس کے بعد وہ دوبارہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر دو تین گھنٹے میٹنگ رہی اور اس کے بعد انہوں نے پھر اسی طرح ایکسرسائز کے لیے وقفہ کیا۔ چونکہ وقفے وقفے سے سارا دن میٹنگ چلنی تھی اس لیے انہوں نے چار مرتبہ اس طرح ہلکی پھلکی ورزش کی۔

کہتے ہیں کہ میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ماڈرن ریسرچ ہے کہ دن میں ایک ہی مرتبہ بھاری ایکسرسائز کرنے کی بجائے دن میں کئی مرتبہ ہلکی پھلکی ورزش کر لی جائے تو انسان کا جسم زیادہ صحت مند رہتا ہے اور اس کی زندگی لمبی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے دل میں سوچا کہ یہ بے چارے دن میں چار پانچ مرتبہ ایکسرسائز کی بجائے، اگر کلمہ پڑھ کر دن میں پانچ مرتبہ نماز ہی پڑھ لیتے تو ان کی یہ ایکسرسائز تو خود بخود ہی ہو جاتی۔ واقعی! ہم جو دن میں نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو ہمارے کتنے ہی مسلز کی ایکسر

سائز خود بخود ہو رہی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ نعمت اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کی وجہ سے خود بخود مل رہی ہوتی ہے۔ اللہ اکبر کبیرا!

رویتِ ہلال اور جدید سائنسی ترجیحات:

اب میں آپ کو زیادہ سائنسی بات بتا دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کا زیادہ سائنسی ذوق بھی ہو...... رمضان شریف کے روزوں کے بارے میں نبی علیہ السلام کی ایک حدیث مبارکہ ہے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا،

صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ

''تم جب چاند کو دیکھو تو روزہ رکھو اور جب چاند کو دیکھو تو پھر افطار کرو۔''

آج کل چاند کو دیکھنے کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں دو گروہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جب ہم چاند دیکھیں گے تب ہم روزہ رکھیں گے۔ اور جب چاند کو دیکھیں گے تب عید منائیں گے۔ مسلمانوں کا ایک دوسرا نیا گروہ بھی ہے، وہ ماڈرن طبقہ ہے، وہ سائنس پڑھنے والے مسلمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج تو انسان چاند پر پہنچ چکا ہے لہٰذا ہمیں پورے سال کا شیڈول بنا لینا چاہیے کہ کس دن چاند نظر آئے گا پھر اس کے مطابق ہمیں عمل کر لینا چاہیے، چنانچہ آج کے دور میں چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس بات پر اب عمل بھی ہو رہا ہے۔ کچھ ملکوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے شروع ہونے سے پہلے وہ بتا دیتے ہیں کہ فلاں دن تراویح ہوگی اور فلاں دن عید کی نماز پڑھی جائے گی۔

اس لیے باہر ملکوں میں دو طرح کی عیدیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چاند کو دیکھ کر عید پڑھیں گے اور چاند کو ہی دیکھ کر روزے رکھیں گے۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے سائنس پڑھی ہوئی ہے، ہم تو سائنس دان بن چکے ہیں، کمپیوٹر میں انجینیئرنگ کر لی ہے، فلاں ڈگری بھی حاصل کر لی ہے اور فلاں بھی، ہمیں تو اعداد و شمار

سے ہی پتہ چل جاتا ہے، اس لیے ہم پہلے سے ہی پیش گوئی کر لیتے ہیں، پھر اسی کی بنیاد پر اعلان کر دیتے ہیں کہ فلاں دن رمضان شریف ہوگا اور فلاں دن عید ہوگی۔

ایک مرتبہ ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ستائیس میڈیکل ڈاکٹرز موجود تھے۔ ان کے درمیان مجھے بیان کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی مہربانی کی کہ بعد میں وہ سب ڈاکٹر سلسلے میں بیعت ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگیاں بھی بدل دیں۔

وہاں پر یہی رویت ہلال کی بحث چل پڑی۔ پھر وہ ڈاکٹرز کہنے لگے کہ اچھا! ہم حضرت صاحب سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا: حضرت! آج کے دور میں چاند دیکھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ہم اعداد و شمار بھی کر سکتے ہیں:

میں نے کہا: بھئی! نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِه

''تم جب چاند کو دیکھو تو روزہ رکھو اور جب چاند کو دیکھو تو افطار کرو۔''

اس لیے ہمارے سامنے تو ایک سیدھا سا اصول ہے کہ ہم اس حدیث پر عمل کیا کریں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر صاحب جو قرآن مجید کی کچھ زیادہ ہی فہم رکھتے تھے وہ کہنے لگے کہ آج کے دور میں بھی آپ یہ بات کر رہے ہیں: حالانکہ آپ نے انجینیئرنگ بھی کی ہوئی ہے۔ کیا آج بھی چاند دیکھنے کی ضرورت ہے؟ آج تو بندہ پہلے ہی پیش گوئی کر سکتا ہے، جب چاند پر انسان پہنچ چکا ہے تو کیا اس کو پتہ نہیں کہ چاند نظر کب آئے گا؟

پھر میں نے اس کو حقیقت سمجھائی۔ میں نے کہا: ہمارے سامنے کچھ عرصہ پہلے یہ مسئلہ آیا تھا، ہم نے کہا کہ ہم خود اس کے بارے میں ریسرچ کرتے ہیں تاکہ ہمیں پتا چلے کہ حقیقت کیا ہے۔

جب چاند کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو ایک آخری دن ایسا آتا ہے کہ جب چاند نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔اس کو جب دیکھیں تو وہ ان دنوں میں سیاہ ہو چکا ہوتا ہے،نظر ہی نہیں آتا۔ سائنس کی ٹرمینالوجی (اصطلاح) میں اسے Birth of new moon. (نئے چاند کی پیدائش) کہتے ہیں۔اس کو سمجھنے میں ہمارے کئی دوست غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ Crest (ہلال) کو نیا چاند کہہ دیتے ہیں۔سائنس کی زبان میں وہ نیا چاند نہیں۔ ہلال اور نئے چاند میں فرق ہے۔جب چاند گھٹتے گھٹتے نظر آنا بند ہو جاتا ہے تو اس کو Birth. of new moon. کہتے ہیں۔پھر اس کے سترہ یا بیس گھنٹوں کے بعد وہاں چاند نظر آ سکتا ہے۔اس کو ہلال کہتے ہیں۔ہم اس Crest (ہلال) کو دیکھ کر عید مناتے ہیں۔New moon (نئے چاند) کو دیکھ کر نہیں مناتے۔تو یہ ایک سائنسی مغالطہ ہے جو ہمارے لکھے پڑھے حضرات کو لگ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:جی سائنس دانوں نے کہہ دیا ہے کہ اب Birth of new moon (نئے چاند کی پیدائش) ہو چکی ہے۔لہٰذا نظر آ جائے تو بھی عید پڑھو اور نظر نہ آئے تو بھی عید پڑھو۔او خدا کے بندو! سمجھنے کی کوشش کرو کہ سائنس دان Birth of new moon کس کو کہہ رہے ہیں؟ جب چاند بالکل نظر آنا بند ہو جائے۔کبھی کبھی چاند کی پیدائش کے بیس گھنٹے ہوتے ہیں۔اور کبھی کبھی بارہ چودہ گھنٹے بھی ہوتے ہیں۔اس دوران یہ چانس بھی ہوتا ہے کہ چاند نظر آ جائے اور یہ چانس بھی ہوتا ہے کہ نظر نہ آئے۔ایسی صورت میں سائنس دان پھنس جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایسی ہی صورت حال تھی اور قدر تا میں اس وقت امریکہ میں تھا۔ہمیں تو وہاں ایک ایک منٹ میں تین تین کالیں آ رہی ہوتی ہیں کہ حضرت! بتائیں کہ چاند نظر آئے گا کہ نہیں، اگر چاند نظر آ گیا تو ہم روزہ رکھیں گے اور نظر نہ آیا تو ہم روزہ نہیں رکھیں گے۔ان کو ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔آپ

بھی کوشش جاری رکھیں، تاکہ سنت پر بھی عمل ہو جائے اور ہم Space Museum (خلائی عجائب گھر) سے بھی معلومات لیتے ہیں۔

واشنگٹن میں بہت سارے عجائب گھر ہیں۔ انہیں Smithsonion series of museums کہتے ہیں۔ دنیا ان کو دیکھنے کے لیے جاتی ہے۔ ان میں سے ایک Space Museum (خلائی عجائب گھر) بھی ہے۔ وہاں ایک ایسا ڈیپارٹمنٹ ہے جہاں خلا کے اندر چوبیس گھنٹوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

میں نے وہاں سے سپیس میوزیم میں فون کیا اور وہاں پر بیٹھے ہوئے بندے سے میں نے خود بات کی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں امریکہ میں فلاں جگہ پر ہوں، کیا اس وقت مجھے Crest (ہلال) نظر آ سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نظر آنے کے چانسز ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے۔ میں نے کہا: کیا مطلب؟ اس نے مجھے ایک موٹی سی بات سمجھائی کہ چاند اپنے جس مدار کے اندر چل رہا ہے اس کا وہ مدار ایک لائن کی طرح نہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ پانچ سو کلومیٹر موٹا ٹائر ہے اور اس کے اندر چاند کہیں سے بھی گزر سکتا ہے۔ یعنی قریب سے بھی گزر سکتا ہے اور دور سے بھی گزر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں سمجھیں کہ وہ مدار کسی دھاگے کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ مدار کئی کلومیٹر موٹا ہے۔ اس میں چاند بالکل دائرے کی شکل میں نہیں چل رہا، لہٰذا قریب سے بھی گزر سکتا ہے اور دور سے بھی گزر سکتا ہے۔ اس لیے کہ

...... چاند کے اپنے اندر زلزلے بھی آتے ہیں،

...... چاند کے اپنے اندر کئی پراسیس ہو رہے ہوتے ہیں،

...... یوں سمجھیں کہ ایٹم بم چل رہے ہوتے ہیں۔

لہٰذا چاند کی پوزیشن مختلف ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ

چاند نظر آئے گا یا نہیں آئے گا۔

ان کی ایک Naval Observatory (بحریہ کا تحقیقاتی ادارہ) ہے۔ بحریہ والوں کو چاند کی گردش کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ چاند کی چودہ تاریخ کو High Tide (جوار بھاٹا) ہوتا ہے۔ High Tide سے کیا مراد ہے؟ کہ اس تاریخ کو سمندر کے اندر بہت ہی زیادہ مدوجزر ہوتی ہے۔ اس لیے جہاز رانوں کو پتا ہونا چاہیے کہ High Tide کب ہوگی اور Low Tide کب ہوگی۔ لہٰذا وہ چاند کی گردش کے بارے میں معلومات لیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا آج دنیا کہتی ہے کہ

We trace each inch of the trajectory of moon.

''ہم چاند کے راستے کے ایک ایک انچ کو ٹریس کرتے ہیں۔''

اس لیے ہمارے پاس چاند کے بارے میں ہر وقت صحیح اور تازی ترین معلومات ہوتی ہیں۔ میں نے اس بحریہ کے تحقیقاتی ادارے میں خود فون ملایا۔ وہاں پر ایک خاتون تھی۔ اس نے کہا کہ ہمارے کمپیوٹر سیکشن میں آپ کو اس کا جواب مل سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے کمپیوٹر سیکشن میں رابطہ کیا۔ وہاں بھی ایک خاتون انجینیئر بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں فلاں جگہ سے بول رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آج میں اپنی آنکھوں سے چاند دیکھوں۔ اب آپ بتائیں کہ سپر کمپیوٹر کے مطابق اس کے کتنے چانسز ہیں۔ اس نے کہا: جی! ہم بتا نہیں سکتے، کیونکہ آج اس مہینے میں ایسا معاملہ ہے کہ چاند نظر آ بھی سکتا ہے اور نظر نہیں بھی آ سکتا۔ میں نے کہا: وہ کیوں؟ اس نے مجھے ذرا اور زیادہ تفصیل سے بات سمجھائی۔

وہ کہنے لگی: دیکھیں! ہم جب چاند کی Trajectory (راستے) کو ماپتے ہیں تو ہمارے پاس بظاہر کوئی چیز نہیں ہوتی، ہمارے پاس ایک Mathematical Mathematical model (ریاضیاتی ماڈل) بنا ہوا ہے جسے ہم

simulatro کہتے ہیں۔وہ ایکواینشز ہیں۔وہ Mathematical equations (حسابی مساوات) کتنی ہیں؟ وہ 10000 ایکواینشز ہیں ان کو ہم کیلکو لیٹ کر کے بتا سکتے ہیں کہ اس وقت چاند کہاں ہو گا۔لیکن اس میں six thousand (6000 متغیرات) vriables ہوتے ہیں..... جو لوگ Mathematics (ریاضی) پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کچھ Constants (مستقل مقداریں) ہوتی ہیں اور کچھ Variables (متغیر مقداریں) ہوتی ہیں..... اس خاتون نے کہا کہ ان ایکواینشز میں چھ ہزار متغیر مقداریں ہیں اور کسی ایک Variable (متغیر مقدار) کے Vary (متغیر) ہونے سے چاند کی لوکیشن میں فرق پڑ سکتا ہے۔وہ کہنے لگی جب چاند کی Trajectory (راستے) میں چھ ہزار Variables (متغیر مقداریں) ہیں تو کون گارنٹی سے کہہ سکتا ہے کہ چاند اس وقت یہاں ہو گا۔لہٰذا ہم سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتے، باوجود اس کے کہ ہم چاند پر پہنچ چکے ہیں۔لہٰذا یہ تو بندہ دیکھ کر ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔

میں نے کہا: قربان جاؤں اپنے آقا ﷺ کی سنت پر، جو لوگ سائنس دان بن کر چاند پر پہنچ چکے ہیں وہ بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ چھ ہزار متغیر مقداروں میں سے کسی ایک میں بھی فرق آ جائے تو چاند کی لوکیشن میں فرق پڑ سکتا ہے۔لہٰذا ہم ایکواینشز پر اعتماد نہیں کر سکتے۔اگر فیصلہ کرنا ہو گا تو ہمارے پاس اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ ہم ظاہر میں دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔نبی علیہ السلام نے چودہ سو سال پہلے بتا دیا تھا کہ۔

صُوْمُوا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِه

''تم جب چاند کو دیکھو تو روزہ رکھو اور جب چاند کو دیکھو تو افطار کرو۔''

معلوم ہوا کہ اتنی ریسرچ کے باوجود:

''کھوتی مڑ ترکے بوہڑ ہیٹھ''

جب بحریہ والوں نے بھی کہہ دیا کہ ہم نہیں کہہ سکتے، یہ تو دیکھ کر فیصلہ کرنا پڑے گا تو میں نے کہا کہ پھر میرے آقا ﷺ کی بات سچی ہوئی۔ پتا چلا کہ ہم سائنس میں جتنا بھی آگے چلے جائیں۔ بالآخر میرے آقا اور میرے سردار ﷺ کی ہی باتیں سچی اور پکی ہوں گی اور ہمیں بالآخر ہوں گھٹنے ٹیکنے ہوں گے اور ان چیزوں کو قبول کرنا ہو گا۔

عزیز نوجوانو! اگر ہم سائنس پڑھنے والے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم سنت پر سائنس کے نقطۂ نظر کے مطابق بھی سوچ بچار کیا کریں اور نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں کے فائدے ہم لوگوں کے سامنے کھولیں تا کہ سنت کو چھوڑ کر زندگی گزارنے والے ذوق اور شوق سے سنتیں اپنائیں۔ وہ دنیا میں بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور ان کا آخرت کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ اس نقصان پانے والی انسانیت کا فائدہ سوچیے اور اس کو سنت کے راستے پر لگانے کی کوشش کیجیے۔ جو آدمی پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے اور اس کو سائنس کی روشنی نہیں پہنچ سکی، اس کو دنیا تو فائدہ نہیں پہنچا سکی، مگر میرے محبوب ﷺ کی مبارک سنتوں نے اسے بھی فائدہ پہنچا دیا۔ اگر وہ پہاڑ کی چوٹی پر رہ کر سنت پر عمل کر رہا ہے، گویا اس کو وہاں بھی فائدہ مل رہا ہے۔ محسنِ انسانیت کے طریقوں میں انسانیت کے لیے فائدے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے محبوب ﷺ کی ایک ایک سنت پر عمل کر کے اللہ کے ہاں بھی سرخرو ہو جائیں اور دنیا کے فائدے بھی پا جائیں۔

نمازوں کی رکعتیں اور سائنسی توجیہات:

جب آدمی رات کو سوتا ہے تو اس کی نبض کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے اور جب صبح اٹھتا ہے تو اس کے جسم میں شوگر لیول بھی ڈاؤن ہوتا ہے۔ اس کا بلڈ پریشر بھی کچھ ڈاؤن ہوتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر شوگر والوں کو کہتے ہیں کہ صبح اٹھ کر آپ اپنا شوگر لیول

چیک کریں کہ کتنا ڈاؤن ہو چکا ہے۔ جب صبح کے وقت اس کا کولیسٹرول لیول ہی ڈاؤن تھا اور شوگر لیول بھی ڈاؤن تھا تو اس ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے آدمی کو ایکسر سائز کرنے کا حکم دیا۔ جس کو فجر کی نماز کہتے ہیں۔ اس نماز کی رکعتیں کتنی بنائی گئیں؟ چار رکعتیں یعنی مختصر سی۔ کیوں؟ اس لیے کہ لیول پہلے ہی ڈاؤن ہے۔ لہٰذا زیادہ ایکسر سائز کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن جب دن ہوا تو اب ہم نے ناشتہ بھی کر لیا، پھر دوپہر کے وقت ماشاءاللہ ٹکا کے دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد شوگر لیول اور کولیسٹرول لیول اوپر چلا گیا تو رب کریم نے ظہر کی رکعتیں بھی کتنی بنا دیں؟ بارہ رکعتیں۔ اس لیے کہ بھئی! اب چار رکعتوں سے تیرا کام نہیں بنے گا۔ تو نے ٹکا کے کھایا ہے، اوپر سے فانٹا کا جام بھی چڑھایا، پھر آئس کریم کا کپ بھی کھایا، لہٰذا اب چار رکعتوں کی بجائے بارہ رکعتوں سے تیرا کام بنے گا۔ اس لیے تم اب بارہ رکعتیں پڑھو۔ چنانچہ ہم نے جب بارہ رکعتیں پڑھ لیں تو ہمارا کولیسٹرول لیول اور شوگر لیول اور بھی ڈاؤن ہو گیا۔

عصر کے وقت کے لیے بارہ رکعتوں کی ضرورت نہیں بلکہ چار رکعتوں سے بھی کام بن سکتا ہے۔ باقی چار آپشنل کہہ دی گئیں۔ یعنی چار تو فرض ہیں اور باقی چار سنت غیر مؤکدہ ہیں، اگر پڑھ لیں تو اس میں تمہارا فائدہ ہے اور اگر نہیں پڑھو گے تو تمہارے مرضی ہے۔ تمہیں ان کو چھوڑنے کی بھی اجازت ہے۔ لہٰذا عصر کے وقت کی ایکسر سائز بھی تھوڑی کر دی گئی۔

اس نماز کے بعد ہم چائے پیتے ہیں اور تھوڑے بہت بسکٹ کھاتے ہیں، اسے عصرانہ کہتے ہیں۔ پھر مغرب کی نماز میں سات رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اب رکعتیں کیوں بڑھا دی گئیں؟ اس لیے کہ تم نے چائے پی اور انگلش بسکٹ کھائے۔ جس سے تمہارا کولیسٹرول لیول اتنا اونچا ہو گیا کہ اب تمہیں پہلے کی نسبت زیادہ ایکسر سائز

کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اب سات رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

مغرب کے بعد ہم نے پھر ڈنر لیا، اس میں دوستوں کو بھی بلایا اور ٹکا کے کھایا۔ لہٰذا پروردگار نے عشاء کی نماز کی سترہ رکعتیں کر دیں...... کیوں بھئی! دوپہر کا کھانا کھایا تھا تو بارہ رکعتیں اور رات کا کھانا کھایا تو سترہ رکعتیں...... اس لیے کہ دن کی بارہ رکعتیں پڑھنے کے بعد بھی ہم نے جاگنا تھا اور کام کرنا تھا اور کولیسٹرول لیول اور شوگر لیول کم ہونے کا موقع موجود تھا۔ مگر اب تو تم نے کھا کے سو جانا ہے لہٰذا تمہیں اضافی کام کرنا پڑے گا۔ پروردگار نے ہماری صحت کا خیال رکھا۔

رمضان المبارک میں ہم سارا دن روزے کے ساتھ رہتے ہیں اور جب افطاری کا وقت آیا تو ہم نے خوب کھجوریں بھی کھائیں، اور خوب روح افزا بھی پیا، خوب کباب بھی کھائے اور خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ لہٰذا پیٹ بھر کر کھانے کے بعد پروردگار نے فرمایا: تم نے بھوکے رہنے کے بعد اب کسر نکالی ہے لہٰذا اب سترہ رکعتوں سے بھی کام نہیں بنے گا۔ اب بیس رکعتیں اور بھی پڑھنی پڑھیں گی۔ کیونکہ تمہارا کولیسٹرول لیول اور شوگر لیول بہت زیادہ ہائی چلا گیا ہے۔ اب تمہیں اضافی محنت کرنی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ ایک بندہ اپنے گھر سے باہر سفر پر چلا۔ جب بندہ سفر پر جاتا ہے تو بھاگ دوڑ کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی ادھر اور کبھی ادھر ایکسر سائز ہوتی رہتی ہے۔ اس ایکسر سائز میں شوگر لیول تو پہلے ہی ڈاؤن ہوتا ہے۔ پروردگار جانتے ہیں کہ اس کا شوگر لیول اور کولیسٹرول لیول ڈاؤن ہے، لہٰذا مسافر کے لیے اللہ تعالیٰ نے جماعت معاف اور نماز ہاف (آدھی) کر دی۔

معلوم ہوا کہ پروردگار نے ہمیں جو بھی حکم دیا اس میں ہم انسانوں کا ہی فائدہ ہے۔ لہٰذا اگر ہم نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں پر عمل کرتے چلے جائیں گے تو ہمیں

خود بخود فائدے ملتے چلے جائیں گے۔ چاہے ہمیں پتہ ہو یا نہ پتہ ہو۔ یہ دنیا ٹھوکریں کھاتی پھرے گی اور بالآخر ریسرچ کر کے جس منزل پر پہنچے گی، یہ وہی جگہ ہوگی جہاں میرے محبوب ﷺ کے قدموں کے مبارک نشان ہوں گے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

بڑے بڑے سائنس دان ریسرچ کرنے کے بعد بالآخر کہاں پہنچیں گے؟ اس جگہ پر جہاں میرے محبوب ﷺ کی سنت ہوگی۔ تو کھوتی نے مڑ تڑ کے کہاں پہنچنا ہے؟ اس بڑ کے درخت کے نیچے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پہلے ہی اس شجرۂ طیبہ کا سایہ عطا فرما دے اور نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں والی زندگی عطا فرما دے، تاکہ ہم دنیا میں بھی سرخرو ہوں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ﴾

رسوخ فی العلم کیسے؟

بیان: پیر طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجدی
دامت برکاتہم

اقتباس

"نفس پرستی، شہوت پرستی، زر پرستی، زن پرستی، یہ سب کی سب بت پرستی کی اقسام ہیں، خدا پرستی کوئی اور چیز ہے۔"

ہم نے خدا پرستی سیکھنی ہے، خواہشات کی پوجا نہیں کرنی۔ ہم نے اپنے رب کی مرضی پر عمل کرنا ہے۔ یہ سب سے مشکل کام ہے۔ جس طالب علم نے اپنے نفس کو لگام دے دی، لوہے کا لنگوٹ باندھ لیا۔ اس کے لیے پھر اللہ تعالیٰ علم کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

اگر یہ تین چیزیں ہمارے اندر آجائیں تو ہمیں رسوخ فی العلم نصیب ہو جائے گا۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

رسوخ فی العلم کیسے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ○ ﴾

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ مَقَامٍ اٰخَرُ

﴿ وَ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ

وَ کَانُوْا عَلَیْہِ شُھَدَاءَ ﴾

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ مَقَامٍ اٰخر

﴿ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ

وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴾

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

کتابِ الٰہی کے محافظ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ ﴾

رَبّٰنِیُّوْنَ سے مراد ''رب والے'' ''اللہ والے'' اَحْبَار حبر کی جمع ہے، یعنی ''علم والے''۔ یعنی ''علمائے کرام اور مشائخ عظام'' ان کا فرضِ منصبی کیا ہے؟ ﴿ بِمَا

﴿اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾۔انہوں نے اللہ رب العزت کی کتاب کی حفاظت کرنی ہے۔انہوں نے قرآن مجید کی ہر ہر آیت پر ڈیرے ڈالنے ہیں۔الفاظ کی بھی حفاظت کرنی ہے اور معانی کی بھی حفاظت کرنی ہے۔

جس طرح حفاظِ کرام الفاظِ قرآن کے محافظ ہیں اور علمائے کرام معانیءِ قرآن کے محافظ ہیں، اسی طرح محدثین کرام الفاظِ حدیث کے محافظ ہیں اور فقہائے کرام معانی حدیث کے محافظ ہیں۔

حدیث کہتے ہیں بات کو اور فقہ کہتے ہیں بات کی سمجھ کو۔

﴿فَمَا لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾

''اس قوم کو کیا ہوا کہ بات ہی نہیں سمجھتے؟''

بات کی سمجھ انسان کو تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔یہ بچے جو آج شاگرد بن کر استاد کے سامنے پڑھ رہے ہیں یہ کل مسندِ ارشاد پر بیٹھ کر دوسروں کو پڑھا رہے ہوں گے۔

نیت کی اہمیت:

ہر عمل کی ابتدا نیت سے ہوتی ہے۔اس لیے آج کی اس محفل میں طلبا اپنے کام کی ابتدا تصحیحِ نیت کے ساتھ کریں۔انسان جس راستے پر چلتا ہے اسکے ذرات بھی نظر آتے ہیں اور جس راستے پر نہیں چلتا اس کے پہاڑ بھی نظر نہیں آتے۔نیت کو صحیح کرنا یہ عمل کی بنیاد ہے۔نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

اکابرینِ امت نے نیت کی اہمت کے بارے میں گراں قدر اقوال ارشاد فرمائے ہیں، مثال کے طور پر:

⊙......سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

لَا عَمَلَ لِمَنْ لَّا نِيَّةَ لَهُ

''جس بندے کی کوئی نیت نہیں اس کا عمل نہیں''

⊙ ...... یحیٰی بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''نیت کرنا سیکھو! اس لیے کہ نیت کرنا عمل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔''

⊙ ...... داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کبار اولیا میں سے گزرے ہیں۔ وہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے جو مجلس تدوینِ فقہ بنائی تھی اس کے چالیس نمایاں حضرات میں سے تھے۔ اس مجلس میں،

⊙ ...... امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جیسے کثیر الحدیث عالم تھے،

⊙ ...... قاسم بن معین اور محمد بن حسن جیسے ادب اور عربیت کے ماہر تھے،

⊙ ...... امام زفر رحمۃ اللہ علیہ جیسے قیاس اور استحسان کے بادشاہ تھے،

اس مجلس میں داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جیسے تقویٰ کے پہاڑ بھی تھے۔ یہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''حسنِ نیت ہر خیر کا مجموعہ ہے۔''

⊙ ...... سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ خود صاحبِ مذہب فقیہ گزرے ہیں۔ یہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں کچھ بڑے تھے مگر علم میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ ان کی کتب منگوا کر اپنے پاس رکھا کرتے تھے اور پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک عالم ان سے ملنے آئے تو انہوں نے ان کے سرہانے کے نیچے پڑی ایک کتاب دیکھی۔ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی ہوئی کتاب ''کتاب الرھن'' تھی۔ انہوں نے پوچھا: حضرت! آپ بھی یہ کتابیں پڑھتے ہیں؟ فرمانے لگے:

''میرا جی چاہتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سب کتابیں میرے پاس ہوں اور

میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔"

یہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"میں اپنی نیت کی نگرانی سب سے زیادہ کرتا ہوں اس لیے کہ یہ ہر وقت ادلتی بدلتی رہتی ہے۔"

یعنی نیت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ نیت کی نگرانی بھی کرتے تھے۔

◉......امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بزرگ آتے تھے۔ ان کو ابو ہاشم صوفی کہا جاتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریا کی دقیق باتوں سے کبھی واقف نہ ہو سکتا۔"

اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر پتہ چلتا ہے کہ ریا کیا ہوتی ہے اور تصحیح نیت کیا ہوتی ہے؟

◉......یوسف بن اسباط رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"نیت کو ٹھیک رکھنا بڑے بڑے عمل کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔"

◉......عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بارے میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس بات کی آرزو ہی کرتا رہا کہ میری زندگی کا کوئی ایک سال عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی مانند گزر جائے مگر میں تین دن سے زیادہ اس ترتیب پر نہ گزار سکا۔ وہ عبداللہ بن مبارک فرمایا کرتے تھے۔

"نیت کے صحیح ہونے سے چھوٹے عمل بھی اللہ کے ہاں بہت بڑے بن جایا کرتے ہیں اور نیت کے صحیح نہ ہونے سے بڑے عمل بھی اللہ کے ہاں بے قیمت بن جایا کرتے ہیں۔"

حصولِ علم میں نیت کا پہلو:

طلبا کی نیت کیا ہو؟ کیا یہی نیت ہو کہ

- ......ہم عالم بن کر خطیب بنیں گے،
- ......فقیہ بنیں گے،
- ......واعظ بنیں گے،
- ......امام بنیں گے،

نہیں، نیت یہ ہونی چاہیے کہ میں اپنے اللہ کو راضی کرنا چاہتا ہوں، میں یہ کام کیسے کروں، یہ علم مجھے کتابوں سے ملے گا، لہٰذا میں وہ علم پڑھنے کے لیے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ جب آپ اس نیت کے ساتھ پڑھیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بھی عطا فرما دیں گے۔

نیت کی فوقیت عمل پر:

نبی علیہ السلام نے دوسری جگہ پر فرمایا:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهِ

''مومن کی نیت اس کے عمل سے بھی زیادہ بہتر ہوتی ہے''

اس کی تین وجوہات ہیں:

سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ مومن جب بھی کسی نیک عمل کی نیت کرتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی فوراً لکھ دی جاتی ہے۔ اگر چہ بعد میں وہ عمل کرے اور ریاکاری کی وجہ سے اس عمل پر کوئی اجر نہ ملے۔ یعنی عمل پر اجر ملے نہ ملے، نیت پر اجر فوراً مل جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نیت کے اندر دوام ہے، نیت کے اندر طول ہے، عمل کے

اندر نہیں...... وہ کیسے؟...... کہ ایک آدمی زندگی میں نیکی تو سو سال کرتا ہے، اس سے زیادہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی عمر ہی اتنی ہوتی ہے۔ گویا کہ عمل کی ایک حد ہے۔ لیکن اس پر اس کو اجر کیا ملے گا؟ کہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اسی طرح ایک آدمی نے گناہ تو کیے سو سال، لیکن ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محدود عمل پر ہمیشہ سزا، یا محدود عمل پر ہمیشہ جزا!...... اس کا کیا مطلب ہوا؟...... علما نے اس کا جواب لکھا ہے کہ جس نے سو سال نیکی پر گزارے اس بندے کے دل میں نیت یہ تھی کہ جب تک وہ زندہ رہے گا، اس وقت تک اللہ رب العزت کی فرمانبرداری کرتا رہے گا۔ چنانچہ اسی نیت کی وجہ سے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتیں دے دی گئیں۔ اور دوسری طرف جو کافر تھا، اس کی نیت یہ تھی کہ میں اللہ کو نہیں مانوں گا۔ چونکہ اس کی نیت ایسی تھی اس لیے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی سزا دی جائے گی۔ تو عمل محدود ہوتا ہے مگر نیت کے اندر طول ہوتا ہے، اس لیے نیت عمل سے زیادہ افضل ہوتی ہے۔

علما نے اس کی ایک تیسری وجہ بھی لکھی ہے۔ وہ یہ کہ عمل تو انسان جسم کے کسی بھی عضو سے کر سکتا ہے مگر نیت ہمیشہ دل سے ہوتی ہے۔ اور دل چونکہ باقی اعضا سے افضل ہے اس لیے مومن کی نیت بھی باقی اعمال سے افضل ہوتی ہے۔

نیت کی خرابی، اعمال کی بربادی:

یاد رکھیں! جس طرح سرکہ شہد کو فاسد کر دیتا ہے اسی طرح نیت کی خرابی بھی انسان کے عمل کو فاسد کر دیتی ہے۔ ہمارے مشائخ نے کہا کہ اگر انسان چھٹانکوں کے حساب سے اپنے عمل پر محنت کرتا ہے تو منوں کے حساب سے اسے اپنی نیت پر محنت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیت یہ ہونی چاہیے کہ ہم جو کچھ بھی کریں اللہ رب العزت کی رضا کے لیے کریں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط نیت سے ہی کام بن

جائے گا۔ ایک آدمی سفر کی نیت تو کر لے کہ منزل پر جانا ہے مگر قدم ہی نہ اٹھائے تو وہ منزل پر ہرگز نہیں پہنچ سکے گا۔ چنانچہ اگر انسان محض تمناؤں سے سوچے کہ مجھے جنت ملے گی تو یہ احمقوں کی بات ہوگی۔ اس لیے کہ عمل ضروری ہے۔

عملِ صالح کی ضرورت واہمیت:

یہی وجہ ہے کہ ایمان لانے کے ساتھ ساتھ عمل صالح کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا،

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا ﴾

نیک اعمال ہی کی وجہ سے بندے کو اللہ رب العزت کے ہاں عزت نصیب ہوگی۔ اسی لیے کافر لوگ قیامت کے دن اعمال نہ ہونے کی وجہ سے پریشان پھریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾

اگر آپ دیکھیں ان مجرموں کو جو اپنے رب کے سامنے شرمساری کی وجہ سے سر جھکا کے کھڑے ہوں گے۔

اور کیا کہیں گے؟

رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا "اے ہمارے پروردگار! اب ہم نے دیکھ لیا"

وَسَمِعْنَا "اور ہم نے سن لیا"

فَارْجِعْنَا "پس ہمیں واپس دنیا میں لوٹا دیجئے"

نَعمَل صَالِحاً اِنَّا مُوقِنُون

''اب ہم نیک عمل کریں گے، ہمیں پکا یقین آ گیا ہے''

تو معلوم ہوا کہ قیامت کے دن مجرم لوگ بھی تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم نے بھی نیک عمل کیے ہوتے۔

قیامت کے دن انسانوں کو بہت حسرت ہوگی۔ اس لیے قیامت کے دن کا ایک نام ''یَوْمُ الْحَسْرَةِ'' (حسرت کا دن) بھی ہے۔ بہت حسرتیں ہونگی کہ کاش! ہم نے یہ نہ کیا ہوتا۔

⊙......﴿ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِیلًا ﴾

⊙......﴿یٰوَیلَتٰی لَمْ اَتَّخِذْ فُلَاناً خَلِیلاً﴾

کاش میں نے فلاں سے دوستی نہ لگائی ہوتی۔

⊙......﴿ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْجَاءَ نِیْ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴾

تو فرمایا: اس دن تمام انسانوں میں سب سے زیادہ حسرت اس عالم کو ہوگی جس کی باتوں کو سن کر لوگ عمل کریں گے اور جنت میں جا رہے ہوں گے اور وہ خود اپنے عمل کی کمزوری کی وجہ سے جہنم میں ڈالا جا رہا ہوگا۔ اس لیے ایک صحابیؓ فرمایا کرتے تھے کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم دیکھو گے کہ جاہل عبادت گزار ہوں گے اور وقت کے علما بدکار ہوں گے۔ اس لیے علم پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

جو اعمال ہم کر رہے ہیں وہ ہمارے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ ہمارا اٹھنے والا ہر قدم یا تو ہمیں جنت کے قریب کر رہا ہے یا جہنم کے قریب کر رہا ہے۔ اگر شریعت کے مطابق ہے تو جنت کے قریب اور اگر نفسانیت اور شیطانیت کی وجہ سے

ہے تو جہنم کے قریب۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ علم پر عمل کرنے والا انسان اللہ کا دوست ہوتا ہے، لہٰذا انسان اس بات سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگے کہ زبان عالم ہو اور دل جاہل ہو۔ اس لیے ہمارے اکابر فرماتے تھے کہ دنیا میں ہر کسی کا محبوب ہوتا ہے اور ہمارا محبوب نیک عمل ہے، وہ جہاں ملے گا ہم اسے پائیں گے، یعنی کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ نیک اعمال کی تلاش میں رہیں، جتنا کر سکتے ہیں کر لیجیے۔ جیسے تاجر کو جہاں بھی کچھ نفع ہو وہ اسے چھوڑتا نہیں۔ اسی طرح یہ نیک اعمال ہمارے لیے نفع ہیں، اس لیے ہر دن میں انہیں اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ نیک عمل کر کر کے تھکیں اور تھک تھک کر پھر نیک عمل کریں۔ ایک شوق اور لگن ہو، اس لگن کے ساتھ انسان نیک اعمال کرنے میں مگن ہو۔ جب کسی کے پاس وقت کم ہو تو وہ تیزی سے کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر: ایک طالب علم امتحان دے رہا ہے اور وقت بہت کم ہے تو وہ تیز تیز لکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کھلاڑی کے پاس وقت کم ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ رنز بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری زندگی کا وقت کم ہے۔ اس لیے ہم بھی زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے کی کوشش کریں۔ اور یہ بھی کوشش کریں کہ ہم ایسے اعمال کریں جن پر ہمیں بہترین اجر مل سکے۔

رسوخ فی العلم کی معاون تین چیزیں

جلالین شریف کے حاشیے میں لکھا ہوا ہے کہ راسخین فی العلم میں شامل ہونے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔

(۱)......تقویٰ

سب سے پہلی چیز ہے کہ بندے کے اندر تقویٰ ہو۔

اَلتَّقْوٰی فِیْمَا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ اللّٰهِ

''تقوی وہ ہے جس کا تعلق بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔''

تقوی کچھ کرنے کا نام نہیں، بلکہ کچھ کام نہ کرنے کا نام تقوی ہے۔ تقوی کی آسان تعریف یہ ہے کہ ''ہر اس عمل کو ترک کر دینا جس کے کرنے سے تعلق باللہ میں فرق آ جائے، تقوی کہلاتا ہے۔''

دل کی گواہی:

تعلق باللہ میں فرق آ رہا ہوتا ہے یا نہیں، یہ دل بتاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے سینے میں جو یہ دل بنایا ہے، یہ انسان کو صحیح صورت حال بتاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ اگر تم اپنی حقیقت معلوم کرنا چاہو تو اپنے دل سے گواہی لو، دل وہ گواہ ہے جو کبھی رشوت قبول نہیں کرتا، ہمیشہ سچی گواہی دیتا ہے۔ چنانچہ ہم جب بھی اپنی اوقات معلوم کرنا چاہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھیں، ہمیشہ سچی گواہی ہی آئے گی۔ دنیا میں دل کی عدالت سے بڑی عدالت کوئی نہیں۔ اس لیے ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے پوچھا کریں کہ کتنے پانی میں ہو؟ اندر سے صحیح گواہی ملے گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتِیُوْنَ

تقوی کی اہمیت:

قرآن مجید میں جتنی تقوی کی اہمیت بتائی گئی ہے، شاید کسی دوسرے عمل کی اتنی اہمیت نہیں بتائی گئی۔ ایک ایک آیت میں دو دو اور تین تین مرتبہ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے! اگر پورے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ صرف ایک

مرتبہ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم فرما دیتے تو اس کا اختیار کرنا فرض ہو جاتا۔ مگر ہر چند آیتوں کے بعد...... اِتَّقُوا اللّٰہ، اِتَّقُوا اللّٰہ، اِتَّقُوا اللّٰہ...... فرمایا۔ پھر ایک ایک آیت کے اندر دو دو مرتبہ بھی فرمایا۔ کوئی آدمی ایک ہی بات کو ایک سانس میں دو مرتبہ دہرائے تو اس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾

دیکھیں! آیت کے شروع میں بھی اِتَّقُوا اللّٰهَ اور آخر میں بھی اِتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا۔ یہاں تو ایمان والوں سے خطاب کیا اور دوسری جگہ سب انسانوں سے خطاب فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾

آیت ایک ہی ہے اور اس میں دو مرتبہ تقویٰ کا حکم دیا۔

حصولِ برکت اور تقویٰ:

تقویٰ اختیار کرنے سے انسان کی زندگی میں برکتیں آتی ہیں۔ آج زندگیوں میں جتنی پریشانیاں ہیں، یہ برکت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔

...... نہ مال میں برکت

...... نہ قوتِ حافظہ میں برکت

...... نہ عزت میں برکت

...... نہ صحت میں برکت

برکت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ تقویٰ کے سبب برکت نازل ہوتی ہے اور معصیت کے سبب برکت زائل ہو جاتی ہے۔ قرآن عظیم الشان میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے

ہیں:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ﴾

''اگر ان بستی دیسوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان سے اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے''

اللہ والوں کی ہر چیز میں برکت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ راسخین فی العلم ہوتے ہیں۔ ان کے وقت میں برکت آجاتی ہے۔ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کر جاتے ہیں۔ چند مثالیں سن لیجیے:

⊙ ...... حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ کی 925 کتابیں دار العلوم دیوبند کی لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ کتابیں انہوں نے بلا واسطہ لکھیں اور جو کتابیں انہوں نے اپنے شاگردوں اور خلفا کو ہدایات دے کر لکھوائیں، ان کو بھی ملا کر سب کتابوں کی تعداد 2700 بنتی ہے۔ ہم ابھی تک ان کتابوں کو پڑھ بھی نہیں سکے۔

⊙ ...... ایک بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ انہوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کی زندگی کے ایام کو ان کی کتابوں کے صفحات پر تقسیم کیا گیا تو بیس صفحے روزانہ کے بنے۔ اب بیس صفحے نئی کتاب کے روزانہ لکھ دینا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ برکت تھی۔

⊙ ...... قوت حافظہ میں بھی برکت تھی۔ ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شاگرد ایک مرتبہ رات کو دیر سے گھر آیا۔ بیوی الجھ پڑی کہ دیر سے کیوں گھر آیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ درس میں تاخیر ہوگئی۔ اس نے کہہ دیا کہ تیرے استاد کو ہی نہیں کچھ آتا، تجھے کیا آئے گا۔ اس نے غصے میں آکر کہا: اچھا! اگر میرے استاد کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو تجھے تین طلاق۔

جب رات گزر گئی تو ان کے دماغ ذرا ٹھنڈے ہوئے۔ بیوی نے پوچھا: جی! طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ کیونکہ مشروط طلاق تھی۔ وہ اپنے استاد کے پاس پہنچے۔ ابوذرعہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: حضرت! یہ واقعہ پیش آیا ہے، کیا ہمارا نکاح باقی ہے یا نہیں؟ حضرت مسکرائے اور فرمایا: جاؤ! میاں بیوی کی زندگی گزارو، ایک لاکھ حدیثیں مجھے اس طرح یاد ہیں جس طرح لوگوں کو سورت فاتحہ یاد ہوتی ہے۔

زمین کی زینت اور تقویٰ:

یاد رکھیے! آسمان کی زینت ستاروں سے ہے، زمین کے زینت پرہیز گاروں سے ہے۔ جیسے ہمیں آسمان پر ستارے جگمگ کرتے نظر آتے ہیں اسی طرح آسمان والوں کو زمین پر متقی لوگ یوں جھل مل کرتے نظر آتے ہیں۔

معاملات اور تقویٰ:

یہ تقویٰ فقط کھانے پینے کی حد تک محدود نہیں۔ یہ پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔ معاملات میں بھی تقویٰ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھیے۔ تقویٰ کو سمجھنا ہو تو ان کی زندگی بہترین مثال ہے۔

ابتدا میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ایک دن ظہر کے وقت دکان بند کر کے آرہے ہیں۔ کسی نے پوچھا: نعمان! آپ کہاں جارہے ہیں؟ جواب دیا: دکان بند کر کے جارہا ہوں۔ پوچھا: حضرت! اتنی جلدی؟ فرمایا: ہاں! آج موسم ابر آلود ہے اور جب آسمان پر بادل ہوں اس وقت روشنی ٹھیک نہیں ہوتی اور یوں گاہک کو کپڑے کی صحیح کوالٹی کا پتہ نہیں چلتا، میں نے دکان اس لیے بند کر دی کہ کوئی کم قیمت کپڑے کو بیش قیمت کپڑا سمجھ کر دھوکہ نہ کھا جائے۔ اس امت کو تجارت یا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سکھائی یا پھر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سکھائی۔

احتیاط ہی تقویٰ ہے:

آدمی کو ہر کام میں احتیاط کرنی چاہیے۔ مثلاً غیر محرم کے چہرے کی طرف دیکھنا حرام ہے اور اگر برقع میں ہو اور اس پر نظر پڑ جائے تو فتویٰ ہے کہ اس کی اجازت ہے۔ لیکن اس کے کپڑوں کو بھی نہ دیکھنا، اس کا نام تقویٰ ہے۔ یعنی غیر عورت کا چہرہ تو کیا دیکھنا اس کے کپڑوں کو بھی نہ دیکھے۔ یہ سوچے کہ یہ نیلی ہے، پیلی ہے، جو ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔

چنانچہ متقی لوگ ہی اللہ کے ولی بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنْ اَوْلِيَاءُ هُ اِلَّا الْمُتَّقُوْن ﴾

''اس کے ولی وہی ہوتے ہیں جو متقی ہوتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کے عملوں کو قبول فرماتے ہیں۔''

(۲)......تواضع:

طالب علم میں دوسری چیز ایسی ہونی چاہیے جو اس کے اور دوسرے بندوں کے درمیان تعلق رکھتی ہے۔ اس کو ''تواضع'' کہتے ہیں۔

فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ

یعنی جو معاملات اللہ کے بندوں کے ساتھ ہوں اس میں طبیعت کے اندر تواضع ہو۔ تواضع کسے کہتے ہیں؟ دوسروں کے سامنے چھوٹا بن کر رہنا، تواضع کہلاتا ہے۔

بڑا بننے کا طریقہ:

نفس چاہتا ہے کہ بڑا بن کر رہے۔ یاد رکھنا! جو بڑا بننا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ

چھوٹا بن کر رہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بڑا بنا دیں گے۔ چھوٹا بن کے رہنے میں بڑائی ہے۔

زمین کی طرح جس نے عاجزی و انکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں ہو کر

ہمیں تواضع کا یہ سبق اوپر سے ملا ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

''جس نے اللہ کے لیے تواضع اختیار کی، اللہ رب العزت اس کو بلندی عطا فرما دیتے ہیں۔''

نبی علیہ السلام جب کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تھے تو آپ ﷺ ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ میں اس طرح بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں جس طرح غلام اپنے آقا کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيرًا وَ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا

''اے اللہ! مجھے لوگوں کی نگاہوں میں بڑا کر دے اور مجھے میری اپنی نگاہوں میں چھوٹا بنا دے۔''

لوگوں کی نگاہوں میں بڑا کر دے کا کیا مطلب؟ اس لیے کہ بندہ دعوت الی اللہ کا کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک لوگوں کی نظر میں اس کا مقام نہیں ہو گا...... آج حالت یہ ہے کہ ہم لوگوں کی نظر میں چھوٹے ہوتے ہیں اور اپنے آپ میں ہم بہت بڑے ہوتے ہیں ہر وقت یہی بات ذہن میں ہوتی ہے کہ

''اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ''

''میں اس سے اچھا ہوں''

دس پندرہ بندے پڑھانے والے ہوں تو ہر ایک کہتا ہے کہ میں اس سے اچھا ہوں۔ مل کر رہنے والے ہوں تو الجھ پڑتے ہیں، ہر ایک کہتا ہے کہ میں اس سے اچھا ہوں۔ آج لڑائی اس بات کی ہی ہے۔ ہمارے مشائخ ایک عجیب بات فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طلبا کو اس طرح رہنا چاہیے کہ ہر طالب علم دوسرے دوستوں کو سمجھے کہ اصحابِ کہف کی مانند ہیں اور میں اصحاب کہف کے کتے کی مانند ہوں، جس طرح اصحابِ کہف کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے کتے کے ساتھ مغفرت کا وعدہ فرمالیا، میرے دوستوں کے صدقے مولا میری بھی مغفرت فرما دیں گے۔ ہم اس طرح دوسروں کو عزت دے کر دیکھیں، پھر دیکھنا کہ اللہ تعالیٰ کیسے بلندیاں عطا فرماتے ہیں؟

ہمارے حضران نے تو ہمیں چھپنا سکھایا ہے، مگر آج لوگ چھپنا پسند کرتے ہیں۔ اخبار والوں سے جا کر الجھتے ہیں کہ ایک کالم کی خبر کیوں لگائی؟ تین کالم کی ہونی چاہیے تھی۔ کیا اس طرح عزتیں ملیں گی؟ نہیں، بلکہ جھکنے سے عزتیں ملتی ہیں۔

فقیرانہ شان میں اسلام کی وکالت:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ دعوت دی گئی کہ آپ شاہجہان پور میں آیئے اور دینِ اسلام کی دعوت دیجیے۔ عیسائیوں نے بھی آنا تھا، ہندوؤں نے بھی آنا تھا، اس کے علاوہ اور ادیان کے لوگوں نے بھی آنا تھا اور وہاں پر ہر ایک نے اپنے دین کی بات کرنی تھی۔ اس پر ”مباحثہ شاہجہان پور“ کے نام سے ایک کتابچہ بھی موجود ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ چل پڑے۔ حضرت نے ان کو بتا دیا تھا کہ میں ایک دن پہلے ریل گاڑی کے ذریعے پہنچ جاؤں گا۔ حضرت اکیلے ہی چلے تھے۔ ابھی حضرت دو اسٹیشن پیچھے تھے تو دل میں خیال آیا کہ میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ ریل گاڑی کے ذریعے آؤں گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے استقبال کو آ جائیں، اور میں تو استقبال

کے قابل ہی نہیں ہوں۔ چنانچہ خیال آیا کہ ایک اسٹیشن پہلے اتر جاتا ہوں، آگے پانچ میل کا فاصلہ ہے، وہ میں پیدل ہی طے کرلوں گا۔

چنانچہ حضرت ایک اسٹیشن پہلے اتر گئے اور پیدل چل پڑے۔ راستے میں ایک بڑی نہر عبور کرنی پڑ گئی۔ اس کا پل نہیں تھا۔ جب نہر عبور کی تو حضرت کا پاجامہ اس میں بھیگ گیا۔ حضرت نے تہبند باندھ لیا اور پاجامہ کو بچھا دیا تاکہ یہ خشک ہو جائے۔ پھر سوچا کہ اس کو سوکھنے میں تو دیر لگے گی اور اس طرح میرا وقت ضائع ہوگا۔ چنانچہ آپ نے اپنی لاٹھی کندھے پر رکھی اور اس کے پیچھے پاجامہ لٹکا لیا۔ یہ اسلام کا سفیر اپنی فقیرانہ شان میں جا رہا تھا، حضرت اللہ کی یاد میں مست چلتے رہے۔ حضرت علم کے آفتاب اور ماہتاب تھے، جبالِ علم میں سے تھے۔ مگر اس فقیرانہ انداز میں پہنچے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب اس شہر میں پہنچے تو ایک سرائے میں کمرہ کرائے پر لے کر قیام کرلیا اور سوچا کہ کل میں اپنے وقت پر مجلس کی جگہ پہنچ جاؤں گا۔

ادھر جو لوگ انتظار کے لیے آئے ہوئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ ٹرین آچکی ہے اور حضرت ابھی تک نہیں آئے تو وہ حیران ہوئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا مگر کہیں نہ ملے۔ ان میں سے جو بڑے عالم تھے انہوں نے کہا: بھئی پتا کرو کہ ہوسکتا ہے کہ ٹرین میں نہ آسکے ہوں، لیٹ ہو گئے ہوں، کسی اور ذریعے سے پہنچے ہوں اور شہر میں کہیں آ گئے ہوں۔

انہوں نے شہر کی سرائے سے پتا کیا تو قاسم نام کے کسی بندے کا نام نہ ملا۔ انہوں نے کہا کہ میں خود پتہ کرتا ہوں۔ جب انہوں نے خود دیکھا تو انہیں ایک جگہ خورشید حسن کا نام لکھا نظر آیا۔ یہ حضرت کا تاریخی نام تھا۔ حضرت نے اپنے اسی تاریخی نام سے کمرہ بک کروالیا تھا تاکہ کسی کو جلدی پتہ نہ چلے۔ انہوں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ منشی نے کہا کہ یہ ایک بہت ہی نازک بدن والے آدمی ہیں۔ حضرت

جسمانی اعتبار سے بہت ہی نرم و نازک تھے، لہٰذا وہ پہچان گئے کہ حضرت یہی ہیں...... ہم لوگ تو شرح کی مانند ہوتے ہیں اور وہ متن کی مانند تھے۔ اِخْتَصَرَ يَخْتَصِرُ اِخْتِصَارًا فَهُوَ مُخْتَصِرٌ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بَسْطَةٌ فِي الْجِسْمِ نہیں بنایا تھا، بلکہ بَسْطَةٌ فِي الْعِلْمِ بنا دیا تھا...... چنانچہ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت موجود ہیں۔ پوچھا: حضرت! آپ یہاں موجود ہیں، ہم تو آپ کا استقبال کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر جمع تھے۔ فرمایا: اسی لیے تو میں اسٹیشن پر گیا نہیں کہ آپ استقبال کے لیے جمع تھے اور میں استقبال کے قابل نہیں ہوں۔ اس کے بعد حضرت نے ایک عجیب بات کہی جو سونے کی روشنائی سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا:

''چند لفظ پڑھ لیے تھے، مخلوقِ خدا پہچان گئی، ورنہ تو قاسم اپنے آپ کو ایسے مٹاتا کہ کسی کو پتا ہی نہ چلتا۔''

اللہ تعالیٰ ایسی سوچ رکھنے والوں کو عزتیں اور بلندیاں عطا فرماتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے طلبا کی تواضع:

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس سال دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا تو دارالعلوم کی انتظامیہ نے طلبا کی دستار بندی کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کچھ اور طلبا کو لے کر اپنے استاد حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پیش ہوئے۔ تو شیخ الہند نے پوچھا: اشرف علی! کیسے آئے؟ عرض کیا: حضرت! ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ دارالعلوم کی انتظامیہ ہماری دستار بندی کے لیے جلسہ کر رہی ہے، ہم جیسے نالائق طلبا کی دستار بندی ہوگی تو دارالعلوم کی بدنامی ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ انہیں منع فرما دیں۔ یہ سن کر شیخ الہند جلال میں آگئے اور فرمانے لگے: اشرف علی! تم ابھی اپنے اساتذہ کے سامنے ہوتے ہو اس

لیے تمہیں اپنا آپ نظر نہیں آتا، جب ہم نہیں ہوں گے تو تم ہی تم ہو گے۔ اور واقعی وہ وقت بھی آیا کہ جب تم ہی تم کا سماں تھا۔ یوں انہوں نے اپنے آپ کو مٹایا اور اللہ رب العزت نے ان کو اٹھایا......

کسی شاعر نے ایک عجیب شعر کہا:

تواضع کا طریقہ سیکھ لو لوگو! صراحی سے
کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

ایک اور شاعر نے اسی بات کو ایک عجیب انداز سے باندھا

جو اہلِ وصف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے رہتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

جب تک صراحی کا سر نہ جھکے وہ پیمانہ نہیں بھر سکتی۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر بھی تواضع ہو گی تو اللہ تعالیٰ ہم سے بھی علم کا فیض جاری فرما دیں گے۔

(۳)......زہد:

طالب علم کے اندر جو تیسری چیز ہونی چاہیے وہ ہے ''زہد''

فِيْمَا بَيْنَه وَبَيْنَ الدُّنيَا

''جو بندے اور دنیا کے درمیان ہے۔''

زہد کا مطلب:

زہد کا کیا مطلب ہے؟ زہد کا مطلب یہ نہیں کہ چیزیں کم ہوں، اس کا مطلب ہے، خواہشات کا کم ہونا۔ ورنہ تو قیامت کے دن کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو دنیا میں فقرا ہوں گے اور قیامت کے دن قارون کے ساتھ ان کا حشر ہو گا۔ اس لیے کہ ان کے دل کی چاہتیں ہی ایسی ہوں گی۔ اور کئی دنیا کے بادشاہ ہوں گے اور قیامت کے دن ان کو فقرا کے ساتھ کھڑا کیا جائے گا۔ تو دل کی آرزوؤں کے کم ہو جانے کا نام زہد

ہے۔ طلبا کو اس لفظ کو خوب اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اس کی حقیقت کو دل میں بٹھانا چاہیے۔

قناعت کی فضیلت:

دیکھیے! اللہ رب العزت نے ہمیں ایک بڑے کام کے لیے چنا ہے: ہم آخرت کے طلب گار بنیں، دنیا کی طلب کو چھوڑ دیں۔ دنیا طلبی اور چیز ہے، خدا طلبی اور چیز ہے۔ ہم نے خدا طلبی کے راستے کو اپنایا ہے۔ اس لیے رزق کے معاملے میں ہمیں مجاہدہ بھی آئے تو ہم بخوشی قبول کریں۔ لوگ باتیں کرتے رہیں گے۔ مگر تھوڑی دنیا پر راضی ہو جانا بھی بڑی نعمت ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

"جو انسان دنیا میں تھوڑے رزق پر اللہ سے راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے تھوڑے عملوں پر راضی ہو جائے گا۔"

رَضِینَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِینَا

ہم پر اللہ رب العزت کی کتنی رحمت ہے کہ اس نے ہمیں علم کے لیے چن لیا۔ ہمارا اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں، یہ اللہ رب العزت کا ہم پر احسان ہے۔ الحمد للہ

منت منے کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی
منت از و شناس کہ در خدمت گزارشتن

"اے مخاطب! تو بادشاہ پر احسان نہ جتلا کہ تو بادشاہ کی خدمت کرتا ہے، ارے! بادشاہ کی خدمت کرنے والے تو لاکھوں ہیں یہ بادشاہ کا تجھ پر احسان ہے کہ اس نے تجھے خدمت کے لیے قبول کر لیا ہے۔"

تمام برائیوں کی جڑ:

دنیا کی محبت دل سے نکال دیجیے کیونکہ یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ حدیث پاک

میں آتا ہے:

حُبُّ الدُّنیَا رَأسُ کُلِّ خَطِیئَةٍ

''دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔''

اگر دل میں ہوس بھی نہ ہو اور آرزوئیں بھی کم ہوں تو پھر علم کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر طالب علم، علم کی طلب میں سنجیدہ نہ ہو تو اس کے لیے یہ علم، علم نافع نہیں بن سکتا۔

علمائے کرام کے رزق کی ترتیب:

یاد رکھیں! جو مقدر میں لکھا ہے وہ یقیناً مل کے رہنا ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جی اگر آپ عالم بنیں گے تو کھائیں گے کہاں سے؟ ایسا کہنے والے یا تو جاہل ہوتے ہیں یا پھر متجاہل ہوتے ہیں۔ بھئی! عالم بن کر نہیں کھائیں گے تو پھر کب کھائیں گے۔ آپ کوئی ایک مثال بیان فرما دیجیے کہ کوئی حافظ ہو یا عالم ہو اور وہ بھوک پیاس کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا ہو۔ کوئی ایک مثال نہیں دے سکتے۔ زیادہ کھا کر مرنے والوں کی مثالیں تو ہم بھی دیتے ہیں۔ امام مسلم کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ کم کھا کے مرنے کی مثال آپ نہیں دے سکتے۔ البتہ، یہ عاجز اسی جگہ بیٹھے ہوئے آپ کو مثال دے سکتا ہے کہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر، ایم بی بی ایس ڈاکٹر، ایم اے، ایم ایس سی کیے ہوئے کتنے بندے ایسے تھے کہ جن کے حالات ایسے بنے کہ وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے مر گئے۔ تو بتائیے کہ رزق کس لائن پر زیادہ ملا؟ اس علم کی لائن پر زیادہ ملا۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ آپ کو دفتر سے ملتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اللہ کی طرف سے ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہ علما وہاں سے کھاتے ہیں جہاں سے انبیاء کھایا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ انبیا کرام کے وارث ہیں۔ ان کا رزق بھی اسی حساب سے ہے۔ جیسے تنخواہ ملنے کی ایک روٹین ہوتی ہے، کئی جگہوں پر ہاتھ نے دیتے ہیں اور کئی

جگہوں پر بنک کے ذریعے دیتے ہیں، ترتیب مختلف ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق کی جو ترتیب انبیائے کرام کے لیے بنائی تھی وہی علمائے کرام کے لیے بنادی۔

خدا پرستی کوئی اور چیز ہے:

• عزیز طلبا! خواہشات کی رو میں نہیں بہنا، بلکہ خواہشات کو تھام لینا ہے۔ جس نے اپنے نفس کے ساتھ یہ مقابلہ کرلیا، علم کے راستے اس کے لیے کھل گئے۔ اسی لیے بایزید بسطامی فرماتے تھے کہ ''جنت دو قدم ہے''۔ کسی نے پوچھا: حضرت! اس کا کیا مطلب ہے کہ جنت دو قدم ہے؟ فرمایا: ''اے دوست! تیرا پہلا قدم تیرے نفس پر آئے گا تو تیرا دوسرا قدم جنت میں پہنچ جائے گا''۔ اگر نفس کی خواہشات کو پورا کریں گے تو علم سے محروم ہو جائیں گے۔ یاد رکھنا!

''نفس پرستی، شہوت پرستی، زر پرستی، زن پرستی، یہ سب کی سب بت پرستی کی اقسام ہیں، خدا پرستی کوئی اور چیز ہے۔''

ہم نے خدا پرستی سیکھنی ہے، خواہشات کی پوجا نہیں کرنی۔ ہم نے اپنے رب کی مرضی پر عمل کرنا ہے۔ یہ سب سے مشکل کام ہے۔ جس طالب علم نے اپنے نفس کو لگام دے دی، لوہے کا لنگوٹ باندھ لیا۔ اس کے لیے پھر اللہ تعالیٰ علم کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

اگر یہ تین چیزیں ہمارے اندر آجائیں تو ہمیں رسوخ فی العلم نصیب ہو جائے گا۔

اچھے معلم کے دو اوصاف:

اب دو باتیں اساتذہ کی خدمت میں...... ادب کے ساتھ...... اچھے معلم کے اندر دو چیزیں ہونا ضروری ہیں۔

(۱)......اخلاص

پہلی چیز اخلاص ہے۔ پڑھانے کا مقصد اللہ کی رضا ہو۔ اخلاص ہو۔ جب اخلاص ہوتا ہے تو پھر انسان جھگڑوں، فتنوں میں نہیں پڑتا، سازشوں میں نہیں الجھتا، بلکہ وہ دین کا کام کرتا ہے۔ ہمارے حضرات اخلاص کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا اخلاص:

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ایک کافر کے سینے پر چڑھ گئے۔ چاہتے تھے کہ خنجر مار کر اس کا کام تمام کر دیں اسی لمحے اس کافر نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تو آپ پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے پوچھا: آپ نے مجھے قتل کیوں نہ کیا؟ فرمایا: میں تجھے پہلے اللہ کے لیے قتل کرنا چاہتا تھا، جب تم نے تھوک پھینکا تو مجھے غصہ آیا، لہٰذا اگر اب میں تجھے قتل کرتا تو اس میں میرا ذاتی انتقام بھی شامل ہوتا، اس لیے میں پیچھے ہٹ گیا، کیوں کہ میں کوئی کام اپنی ذات کے لیے نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے غصے کے عالم میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا کہ میرا ہر کام اللہ کے لیے ہو۔ اس کو اخلاص کہتے ہیں۔

شیخ الہند رحمہ اللہ کا اخلاص:

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فراغت کے بعد جب ابتدا میں کانپور تشریف لے گئے تو وہاں قریب کے دیہاتوں میں کچھ اہلِ بدعت بھی تھے۔ حضرت نے ایک مرتبہ جلسہ رکھوایا اور اپنے استاذ محترم حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو بلوایا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تشریف لائے اور انہوں نے بیان کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کی شان کہ حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ جو مضمون چاہتے تھے کہ یہ بیان ہو، وہی شروع ہو گیا۔

عین اس وقت جب مضمون اپنے عروج پر تھا اس وقت ایک عالم مولانا لطف اللہ علی گڑھی، جو مائل بہ بدعت تھے، اس طرف تھوڑا سا میلان تھا، وہ آ گئے۔ اب ان کو

دیکھ کر لوگوں نے یہ سوچا کہ اب وقت ہے یہ مضمون بیان ہونے کا۔ جیسے ہی وہ آ کر بیٹھے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا، ''وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ'' اور بیٹھ گئے۔

اب اس طرح ایک دم تقریر بند کر دینا بڑا عجیب سا لگا۔ خیر! بعد میں کھانے کے دستر خوان پر ہی مولانا فخر الحسن نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: بھئی! وہ تو وقت تھا بیان کرنے کا، مولانا لطف اللہ آئے تھے تو آپ نے تو ایک دم ہی تقریر بند کر دی۔ آپ نے فرمایا: ہاں! مجھے بھی یہی خیال آ گیا تھا کہ اب وقت آیا ہے مضامین بیان کرنے کا، لیکن میرے دل میں خیال آیا کہ اب میں اس کو سنانے کے لیے یہ بیان کرتا ہوں تو یہ اس کے لیے ہوگا اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہوگا چنانچہ میں نے بیان بند کر دیا۔ بیان میں بھی اس بات کا خیال ہوتا تھا کہ میری ہر بات اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ اگر اس طرح کا اخلاص آ جائے تو دینی اداروں کے سب جھگڑے ختم ہو جائیں۔

اخلاص کی اہمیت:

اخلاص اتنا ضروری ہے کہ

☆...... علم کی کمی عمل پوری کر جاتا ہے،

☆...... عمل کی کمی اخلاص پوری کر جاتا ہے، مگر

☆...... اخلاص کی کمی کبھی پوری نہیں ہوا کرتی۔

اسی لیے فرمایا:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾

﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾

ملاوٹ والے عمل اللہ کو پسند نہیں:

بھئی! ملاوٹ کو تو دنیا بھی پسند نہیں کرتی۔ حدیث پاک میں نبی علیہ السلام نے

فرمایا:

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا

''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔''

جس طرح لوگ مادی چیزوں میں ملاوٹ کو پسند نہیں کرتے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی عمل میں ریا کی ملاوٹ کو پسند نہیں فرماتے۔ اگر آپ کو ملاوٹ والی کوئی چیز ملے تو آپ اس کو فوراً رد کر دیتے ہیں۔ اللہ رب العزت بھی اسی طرح فرماتے ہیں کہ اگر ملاوٹ والے عمل لاؤ گے تو ہم بھی ان کو رد کر دیں گے۔

ہیرے اور اخلاص کی قیمت میں فرق:

ایک مرتبہ مجھے کوئی صاحب دعا کروانے کے لیے لے گئے۔ مجھے پوچھنے لگے: حضرت! آپ نے کبھی ہیرے دیکھے ہیں؟ میں نے کہا: میں اس لائن کا بندہ نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اتنا شوق ہے۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اس کو کھول کر مجھے ہیرے دکھانے لگا اور ساتھ ساتھ بتانے بھی لگا کہ یہ اتنے لاکھ کا ہے اور یہ اتنے لاکھ کا ہے۔ ہم تو سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ ہم نے کہا: یہ تو بہت چھوٹے ہیں اور آپ قیمت زیادہ بتا رہے ہیں۔ کہنے لگے: حضرت! ہیرا ہمیشہ چھوٹا ہوتا ہے لیکن قیمت میں بڑا ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے یہ بات یاد آئی کہ قیامت کے دن اخلاص نیت کی وجہ سے جن لوگوں نے کام کیے ہوں گے ان کے عمل اگرچہ چھوٹے ہوں گے مگر اللہ کے ہاں ان کی قیمت بڑی موٹی ہوگی۔

مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص:

مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور میں جامعہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ شروع میں وہاں چھوٹی سی مسجد تھی اور چھوٹا سا جامعہ تھا۔ ان کے ہاں ایک ایسے عالم تھے جو حضرت

مدنی کی طرف کچھ میلان رکھتے تھے۔اسی طرز پر جلسے اور سیاست......اور ان کا مزاج ذکر والا تھا۔وہ نیک انسان تھے۔انہوں نے سوچا کہ اکٹھا رہنے میں آپس میں کہیں کوئی تنازعہ نہ کھڑا ہو جائے، اختلافِ رائے نہ بڑھ جائے، لہٰذا ایک سال مکمل ہونے پر انہوں نے اسی محلے میں ایک دوسرے جامعہ کی بنیاد رکھ دی۔

جب انہوں نے نئے جامعہ کی بنیاد رکھی تو لوگ بڑے غصے میں آ گئے کہ اگر نیا جامعہ بنانا ہی تھا تو کہیں دور بنا لیتے۔اسی جگہ، قریب میں نیا جامعہ کھولنا مناسب تو نہیں۔

اس سلسلے میں مفتی محمد حسن کے ایک صاحبزادے نے اپنا ایک واقعہ مجھے خود سنایا۔فرمانے لگے کہ میں کسی کام کے لیے جا رہا تھا تو ایسے ہی میں نے اپنے والد صاحب سے کہا: ابا جی! آپ نے دیکھ لیا ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ ابا جی نے پوچھا: بیٹا! کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا: امی نے کام بھیجا ہے۔فرمایا: تم وہ کام کر کے آؤ، پھر میں آج تمہیں اخلاص کا درس دوں گا۔

جب میں وہ کام کر کے واپس آیا تو بیٹھ گیا اور عرض کیا: ابا جی! بتائیں۔تو والد صاحب نے مجھ سے پوچھا: یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے سر پر کسی چیز کا اتنا بوجھ ہو کہ تم سے اٹھایا نہ جا رہا ہو، حتیٰ کہ گردن ٹوٹنے کے قریب محسوس ہو، تم انتہائی مشقت کے ساتھ وہ بوجھ لے کر جا رہے ہو، اور ایسے وقت میں کوئی دوسرا بندہ آ جائے اور یہ کہے کہ تم آدھا بوجھ مجھے دے دو میں اپنی ذمہ داری سے منزل پر پہنچا دوں گا، تو اب بتاؤ کہ وہ تمہارا دوست ہو گا یا تمہارا دشمن ہو گا؟ میں نے کہا: حضرت! وہ دوست ہو گا۔تو ابا جی نے فرمایا: دیکھو بیٹا! یہ اتنا بڑا شہر تھا اور اس میں یہ ایک دارالعلوم تھا اور اتنے بڑے شہر کی مسئولیت کا بوجھ صرف ہمارے سر پر تھا، اب ایک دوسرا مدرسہ بن گیا ہے اور یوں قیامت کے دن جو پوچھا جائے گا اس کا بوجھ تقسیم ہو گیا، اب ان بوجھ تقسیم کرنے

والوں کو دوست سمجھیں یا دشمن سمجھیں؟ سبحان اللہ! کتنے بڑے مسئلے کو کتنے پیار سے حل کر دیا۔ اس کو اخلاص کہتے ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ فرنگی یہاں سے دفع ہو جائے اور ہم اپنے دین والی زندگی کو عمل میں لا سکیں۔ چنانچہ وہ اس کے لیے بہت متحرک رہتے تھے۔ اور ان کی طبیعت ایسی تھی کہ جب ان کے پاس کوئی مہمان آتا تھا تو وہ مہمان کو بڑے پیار سے رکھتے تھے۔ اس کی خوب خدمت بھی کرتے تھے اور اس کو بڑی محبت دے کر بھیجتے تھے۔

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں اصلاح کا پہلو غالب تھا۔ جو طالب بھی آتے تھے حضرت ان پر سختی فرماتے تھے۔ کیونکہ جب تک سختی نہ ہو تب تک اصلاح نہیں ہوتی...... حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''دب نہ ہو تو ادب پیدا نہیں ہوتا''۔ اس لیے سختی کرنی پڑتی ہے۔ مگر مشائخ کی سختی بھی اللہ کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔ اپنے نفس کے لیے نہیں ہوتی...... چنانچہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب کوئی آتا تھا تو اس کو بات سمجھائی جاتی تھی اور آگے سے وہ نہ مانتا تو حضرت اس کا بستر اٹھوا کر باہر نکال دیتے تھے۔ جیسے حضرت مجذوب سے کوئی بات ہو گئی تھی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم اپنا بستر اٹھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔ مگر وہ طالب صادق تھے۔ انہوں نے سوچا کہ حضرت نے تو مسجد سے ہی نکالا ہے نا، مسجد کے باہر تو میں بیٹھ سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ دروازے کے سامنے بیٹھ گئے اور جب دروازہ کھلتا تو اپنے شیخ کی زیارت کر لیتے اور بیٹھے وہیں رہتے تھے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ وہ وہاں سے گئے نہیں وہاں سے۔ ایک دن حضرت بڑے حیران ہوئے کہ میں

نے اسے بھیج بھی دیا تھا اور یہ اتنے دنوں سے دروازے پر ہی بیٹھا ہے۔ حضرت نے اپنے ایک خادم سے کہا: جا کر اس سے پوچھو یہ چاہتا کیا ہے؟ حضرت مجذوب شاعر تھے۔ چنانچہ انہوں نے جواب میں ایک شعر لکھ کر بھیجا۔

اُدھر تو در نہ کھولے گا اِدھر میں در نہ چھوڑوں گا
حکومت اپنی اپنی ہے اُدھر تیری اِدھر میری

حضرت کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ اسی وقت ان کو بلایا اور ان کی غلطی کو معاف کر دیا۔

ادھر حضرت مدنی ؒ آنے والے مہمانوں کے ساتھ بہت پیار محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک آدمی حضرت مدنی ؒ کے پاس آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کھانا بھی کھلایا، پاس بھی بٹھایا، اچھی اچھی باتیں بھی سنائیں اور رات کو جب سونے لگا تو حضرت نے اس کے پاؤں بھی دبائے۔ جب اس نے بے نفسی کا یہ عالم دیکھا تو کہنے لگا: حضرت! یہ ہوا نا دین۔ آپ تو بندوں کے ساتھ ایسے پیش آتے ہیں ان کا قربان ہونے کو دل چاہتا ہے اور اگر حضرت تھانوی کے پاس چلے جائیں تو وہاں تو یوں لگتا ہے کہ بس لٹھ لے کر بیٹھے ہیں اور وہاں تو بڑی سختی ہوتی ہے۔

دیکھیں! اختلافِ رائے ہو تو عام طور پر بندہ تیلی لگا دیتا ہے۔ اگلے دن تھوڑی سی بات کی اور اس کو بھڑکا دیا، مگر نہیں، یہ ہمارے اکابر کا اخلاص تھا کہ جب اس نے ایسی بات کی تو حضرت مدنی نے فوراً کہا: بھئی نہیں، ایسی بات نہیں ہے، تم معاملے کو سمجھے ہی نہیں۔ اس نے پوچھا: حضرت معاملہ کیا ہے؟ فرمایا: دیکھو! جو بڑے سرجن ہوتے ہیں وہ انسان کے اندر سے پیپ وغیرہ نکال کر چیرا دیتے ہیں اور اس کو نچوڑ کر نکالتے ہیں، اس وقت بندے کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اور جب وہ بندہ کمپوڈر کے پاس آتا ہے تو کمپوڈر اس پر مرہم لگا کر پیار سے اس کو بند کر دیتا ہے، حضرت کی کیفیت

سرجن کی مانند ہے اور میری کیفیت ایک کمپوڈر کی مانند ہے۔ یہ اخلاص تھا ہمارے اکابر میں۔

داغی عملوں کے بدلے جنت:

آپ اگر بازار پھل لینے کے لیے جائیں اور آپ کو ایک روپے کے بدلے میں کوئی داغی سیب دے دے تو آپ قبول نہیں کریں گے۔ کوئی گلا ہوا کیلا دے دے تو آپ کہتے ہیں: جی! تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جس طرح ہم ایک روپے کے بدلے میں گلے ہوئے پھل کو تولنے کی بھی اجازت نہیں دیتے، بالکل اسی طرح قیامت کے دن اللہ رب العزت اپنی جنتوں کے بدلے میں ریا والے گلے ہوئے عملوں کو میزان پر تلنے ہی نہیں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ایک روپے کے بدلے میں داغی پھل کو قبول نہیں کرتے تھے، میں جنتوں کے بدلے میں تمہارے داغی عملوں کو کیسے قبول کروں۔ آپ کی دنیا QCC (کوالٹی کنٹرول سنٹرز) بناتی ہے۔ ہر بندہ کہتا ہے کہ میں نے پیسے دینے ہیں اس لیے مجھے چیز کی کوالٹی چاہیے۔ اللہ رب العزت نے بھی جنتیں دینی ہیں، اپنی رضا دینی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو بھی عملوں کی کوالٹی چاہیے۔

خسارے کا سودا:

یاد رکھیے! یہ جو دنیا تعریفیں کرتی ہے، اکرام کرتی ہے اور عزت کرتی ہے یہ بندے کے عملوں کا اجر ہوتا ہے جو مل رہا ہوتا ہے...... ہم ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دنوں ہمارے ایک انجینئر دوست کسی مشکل میں پھنس گئے تھے، انہیں پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ بے چارے بہت آزردہ تھے کہ میرے پاس وسائل نہیں ہیں اور

کام کرنا بھی ضروری ہے۔

اتنے میں ان کو کیشیر کا فون آیا کہ آپ آکر پیسے لے جائیں۔ وہ فون سن کر بڑے خوش ہوئے اور خوش خوش کیشئر کے پاس کہ مجھے بیس پچیس ہزار ملیں گے اور میرا کام ہو جائے گا۔لیکن جب وہ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ہم نے پوچھا کہ کیا بنا؟ کہنے لگے: جی! بس کیشئر کو غلطی ہوئی۔واؤچر تو میرے ہی نام کے تھے مگر ان کی ادائیگی ہو چکی تھی اور ان پر مہر لگانا بھول گئے تھے۔ جب اس نے تاریخ دیکھی اور ملایا تو ریکارڈ نے بتایا کہ یہ پہلے پے آف ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اس نے کہا ہے کہ اب تو میرے پاس کچھ نہیں۔

جب اس نے یہ بات کہی تو فوراً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ دیکھو! یہ بندہ امید لے کر گیا تھا کہ مجھے کیشئر سے نقدی مل جائے گی، مگر Paid Off (ادا شدہ) واؤچر کی وجہ سے اس بندے کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔یاد رکھنا! جن عملوں کو ہم دنیا کی ناموری کی وجہ سے کرتے ہیں، یہ سب ہمارے پیڈ آف واؤچر ہیں، قیامت کے دن جب اللہ کے پاس جائیں گے تو فرمائیں گے، اے میرے بندے!''فَقَدْ قِيلَ''یہ تو پیڈ آف ہو چکے ہیں، تمہیں دنیا میں ہی اس کا اجر مل چکا ہے، کسی نے تمہاری تعریف کر دی تھی، اب ہمارے پاس اس کا کوئی بدلہ نہیں۔سوچیے کہ اس وقت ہمارا کیا بنے گا؟ کیا یہ مشقتیں ہم دو لفظوں کی خاطر اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم اس لیے عمل کرتے پھرتے ہیں کہ کوئی بندہ اچھے الفاظ کہہ دے یا ہمیں اچھا سمجھ لے تو پھر ہم نے بڑے خسارے کا سودا کر لیا۔کاش! ہم اللہ رب العزت کی رضا کے لیے عمل کرتے اور دنیا سے کوئی طمع نہ ہوتی۔قیامت کے دن ہمیں اس کا اجر ملتا، پھر پتا چلتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان عملوں کی کتنی قدر و قیمت ہے!

ریا کے باعث ثواب سے محرومی:

ایک مرتبہ بایزید بسطامی نے سورۃ طٰہٰ پڑھی۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ نامہء اعمال میں سورۃ طٰہٰ سونے کے پانی سے لکھی ہوئی ہے۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ اللہ رب العزت نے میرا اس سورت کو پڑھنا قبول فرمالیا ہے۔ پھر وہ خوشی خوشی اپنے نامہ اعمال کو دیکھنے لگے۔ جب ایک صفحہ الٹا تو اس میں کچھ خالی جگہ نظر آئی؟ وہ یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ اس میں خالی جگہ کیوں ہے؟ تو خواب ہی میں دل میں خیال آیا، اوہو! جب میں یہ الفاظ پڑھ رہا تھا تو میرے قریب سے ایک آدمی گزرا تھا اور اس وقت میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ یہ میری قرات سن کر خوش ہوگا کہ میں کتنا اچھا پڑھ رہا ہوں! دل میں اس خیال کے آنے پر پروردگار نے ان آیتوں کے ثواب سے محروم فرمادیا...... اخلاص اتنا اہم ہے۔

(۲)......اختصاص

معلم کے اندر دوسری صفت ''اختصاص'' کی ہونی چاہیے۔ کیونکہ تعلیم و تعلم کا کام فقط اخلاص سے ہی نہیں چلتا۔ آدمی مخلص تو بڑا ہو لیکن پلے ہی کچھ نہ ہو، آتا جاتا کچھ نہ ہو، تو طلبا کو کیا فائدہ ملے گا؟ اس کا اخلاص کس کام آئے گا؟ چنانچہ معلم کو ہر اس کتاب میں تخصص حاصل ہو جس کو یہ پڑھانا چاہتے ہیں۔ اگر نہیں تو اپنے مطالعہ سے یہ چیز حاصل کریں۔ بھئی! جب ایک مضمون ملا ہے تو اس میں کما حقہ محنت کیجیے تاکہ آپ کو اس کے پڑھانے میں تخصص حاصل ہو جائے۔

ہمارے اکابر علمائے دیوبند میں یہ دونوں نعمتیں تھیں۔ اخلاص بھی تھا اور اختصاص بھی تھا۔ ان کے پاس جو مضمون ہوتا تھا اس مضمون میں وہ بادشاہ ہوتے تھے۔

طلبا کی استعداد بنانے کا طریقہ:

دارالعلوم کی طرف سے ''شرح تہذیب'' پڑھانے کی ملتی تھی تو سب سے پہلے طلبا کو ''قال اقول'' رسالہ پڑھاتے تھے۔ پھر ''ایساغوجی'' پڑھاتے تھے۔ پھر ''مرقات'' پڑھاتے تھے۔ ایسا کیوں کرتے تھے؟ استعداد بنانے کے لیے۔ اس کے بعد اصل کتاب شرح تہذیب پڑھایا کرتے تھے۔ اور آج حالت یہ ہے کہ جن کو شرح تہذیب دی جاتی ہے، پورے سال میں اس کو ہی ختم نہیں کر پاتے۔ استعداد مسلم کی ہوتی تھی اور پڑھاتے مرقات تھے، آج پڑھا مسلم رہے ہوتے ہیں اور استعداد مرقات کی ہوتی ہے۔ آج اختصاص کی کمی ہے۔ وعظ کر کے طلبا کو بھگتا دینا تو آسان کام ہے مگر یہ علم کے ساتھ دیانت نہیں، بلکہ یہ بددیانتی کہلاتی ہے۔

شیخ الہند اور اختصاص علم:

ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند نے اپنی لائبریری کی کتابوں کو نکلوا کر دھوپ میں رکھا...... برسات کے موسم میں چیزیں بھیگ جاتی ہیں اور دیمک لگ جاتی ہے۔...... جب دھوپ میں کتابیں رکھیں تو ایک طالب علم نے کہا: حضرت! ایک کتاب کے پانچ چھ صفحے دیمک نے کھا لیے ہیں۔ فرمایا: پھر دوسرا کاغذ ساتھ جوڑ دو۔ اس نے دوسرا کاغذ لگا دیا اور پوچھا: حضرت! اب کیا کروں؟ فرمایا: جو عبارت حذف ہو چکی ہے وہ لکھ دو! اس نے کہا: حضرت! مجھے تو وہ زبانی یاد نہیں ہے اور اصل نسخہ بھی نہیں ہے، میں نے تو یہ کتاب کئی سال پہلے پڑھی تھی، اب بھول چکا ہوں، کیسے لکھوں؟ فرمایا: بس بھول گئے؟ کون سی کتاب ہے؟ کہنے لگا: حضرت! میبذی۔ پوچھا: کہاں سے عبارت منقطع ہوئی ہے؟ اس نے کہا: فلاں جگہ سے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے زبانی چھ صفحے کی عبارت اس بچے کو کتاب پر لکھوا

دی۔ ان کو یوں اختصاص حاصل تھا۔

مولانا یحییٰ رحمہ اللہ اور اختصاصِ علم:

مولانا یحییٰ رحمہ اللہ نے مسلم کو دوسو مرتبہ تسبیح پر پڑھا۔ ان حضرات کی زندگی ہی کتابوں میں گزری تھی۔ ان کو کثرتِ مطالعہ کا ایسا شوق ہوتا تھا۔ جب تخصص حاصل ہوگا تو پھر دیکھیے گا کہ کام کیسے بنتا ہے؟

مولانا نور محمد پونٹوی رحمہ اللہ اور اختصاصِ علم:

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک شاگرد تھا۔ اس کا نام مولانا نور محمد پونٹوی رحمہ اللہ تھا۔ آپ نے شرح مأۃ عامل پونٹوی دیکھی ہوگی...... پونٹہ ایک شہر ہے جو ملتان سے ستر پچھتر میل دور مین سڑک سے تیس کلومیٹر اندر ہے۔ طلبا تیس کلومیٹر پیدل سفر کر کے سر پر سامان اٹھا کر ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ اس گاؤں میں تین سو طلبا ان کے پاس پڑھا کرتے تھے۔ وہاں تانگہ بھی نہیں جاتا تھا۔ طلبا اپنا سامان سر پر اٹھا کر وہاں جاتے تھے۔

ایک دلچسپ بات آپ کو بتادوں۔ طلبا خود پڑھیں یا نہ پڑھیں، یہ جاتے وہیں ہیں جہاں پڑھائی اچھی ہو، یہ پکی بات ہے۔

علامہ شریف کشمیری رحمہ اللہ خیر المدارس سے قاسم العلوم آگئے تو ایک طالب علم بھی قاسم العلوم پہنچ گیا۔ ایک استاد نے اس کو دیکھا تو پوچھا: آپ یہاں کیسے؟ کہنے لگا: اس لیے کہ شیخ الحدیث صاحب آگئے ہیں۔ انہوں نے کہا: شیخ الحدیث صاحب تو بخاری شریف پڑھائیں گے اور تو ابھی مرقات کے درجے میں ہے، اس سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟ کہنے لگا: حضرت! جہاں بڑے استاد محنت کرنے والے ہوں وہاں چھوٹوں کو خود بخود محنت کرنی پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہ کو کیا مقام عطا فرمایا تھا؟ مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مدرسہ کے سالانہ جلسے میں اکابرین کی موجودگی میں مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا: شمس النحاۃ تشریف لائے ہیں۔ ایسے محتاط بندے کا کسی کو ''شمس النحاۃ'' کہنا کوئی معنی رکھتا ہے۔

ان کو علم میں اتنا کمال حاصل تھا کہ فرمایا کرتے تھے: اگر ساری دنیا سے شرح جامی ضبط کر لی جائے، مٹا دیا جائے اور کوئی آدمی نور محمد کے پاس آ کر کہے کہ شرح جامی کی ضرورت ہے تو میں اس متن اور حاشیے کے ساتھ شرح جامی دوبارہ لکھوا سکتا ہوں۔ ان کو یہ اختصاص حاصل تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دو عظیم شاگرد دیے۔ عباد اللہ۔ دونوں کا نام عبداللہ تھا۔ ایک عبداللہ بہلوی تھے۔ ماشاء اللہ وہ شیخِ طریقت بھی تھے اور مفسرِ قرآن بھی تھے۔ جب حضرت مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہ شجاع آباد میں آئے تھے تو عبداللہ بہلوی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کے تمام طلبا سے کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کی جوتیوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے، یہ اعزاز میں حاصل کروں گا۔ چنانچہ جب شیخ آتے تھے تو دار العلوم کے مہتمم مولانا عبداللہ بہلوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت کے جوتے خود اٹھایا کرتے تھے۔ دوسرے شاگرد مولانا عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

ایسے شاگردوں کے آنے کی وجہ بھی عجیب تھی۔ اس کے پیچھے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی دعائیں تھیں۔ وجہ یہ بنی کہ انہوں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے دورہ حدیث کیا۔ دورانِ تعلیم یہ رات کو چھپ کر جس راستے سے حضرت دار الحدیث میں آتے تھے، اپنے عمامے کے ساتھ اس راستے کی صفائی کیا کرتے تھے۔ ایک رات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھ لیا۔ انہوں نے بلا کر پوچھا: نور محمد! کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا: حضرت آپ اس راستے سے حدیث کا درس دینے آتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس راستے کو

صاف کروں مگر جھاڑو کے بجائے میں اپنے عمامے سے صاف کرتا ہوں۔بس یہ سنتے ہی استاد کے دل میں محبت آئی اور استاد نے دعا دے دی۔ان کی دعا کام آگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شمس النحاۃ مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہ بنا دیا۔یوں طلباء اپنے اساتذہ سے دعائیں لیتے تھے۔

علمی کاموں کی لگن:

جب اخلاص بھی ہو اور اختصاص بھی ہو تو پھر بندے کے اندر ایک لگن ہوتی ہے اور وہ اس لگن کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہوتا ہے۔ پھر اس کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔مولانا یحییٰ کے دل کے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ میں دھوپ میں بیٹھ کر گنا چوسوں۔چنانچہ سوچا کہ جب فرصت ملی تو چوسوں گا۔ان کو بیس سال تک گنا چوسنے کی فرصت ہی نہ ملی۔وہ ہر وقت علمی کام میں مشغول ہوتے تھے اور وقت فارغ ہی نہیں ہوتا تھا۔جب اختصاص حاصل کریں گے تو آپ ہر وقت کتب کے مطالعہ میں لگے رہیں گے! پھر یہ کتابیں ایک گلشن نظر آئے گا اور اوڑھنا بچھونا نظر آئے گا۔پھر مدرسہ وطن نظر آئے گا اور کتابوں کا کاغذ کفن نظر آئے گا۔اگر آپ اپنے اندر یہ چیز پیدا کر لیں گے تو ایک مقصد کے تحت زندگی گزرے گی۔

خدمتِ اسلام کا جذبہ:

ایک مرتبہ انگریزوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کر لیا۔ حضرت نے جیل کے اندر ایک قیدی کو قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا۔کچھ عرصے بعد آپ کی آزادی کے نوٹس آگئے۔جب جیلر نے آکر حضرت کو بتایا کہ آپ کی گرفتاری ختم ہو گئی ہے۔آپ نے فرمایا: میں تو ابھی گھر نہیں جاتا۔اس نے پوچھا: کیوں؟ فرمایا: میں فلاں قیدی کو قرآن مجید پڑھا رہا ہوں، جب تک مکمل نہیں کروں گا گھر نہیں

جاؤں گا۔ یہ تھے ہمارے اسلاف۔ اگر اس طرح علم کی خدمت کا جذبہ ہوگا اور ساتھ ساتھ اخلاص اور اپنے مضامین کے اندر مہارت ہوگی تو پھر دیکھنا طلبا شمع کے گرد پروانے کی طرح آئیں گے۔

لمحہ فکریہ:

عزیز طلبا! آج کے دور میں جب ہر طرف بے راہ روی بڑھ رہی ہے، عریانی اور فحاشی کا دور دورہ ہے، کیا مشرق اور کیا مغرب! ہر طرف حیا زندگیوں سے نکلتی جا رہی ہے۔ ایسے دور میں دین کی محنت کرنا اور دین کے لیے کام کرنا اللہ کے ہاں بڑی قبولیت کا باعث ہے۔ بس دل میں یہ رکھیے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو ایک چڑیا اپنی چونچ میں ایک دو قطرے پانی لے کر جاتی اور آگ پر گراتی تھی۔ کسی پرندے نے اس سے کہا: بی چڑیا! تیرے دو قطرے پانی سے تو یہ آگ نہیں بجھے گی۔ وہ چڑیا کہنے لگی: یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ میری چونچ کے اس پانی سے آگ نہیں بجھے گی۔ مگر میں نے ابراہیم خلیل اللہ کی دوستی تو نبھانی ہے نا۔ تو بھئی! گناہوں کی یہ آگ تو پتا نہیں پوری کی پوری بجھ پائے گی یا نہیں، لیکن ہم نے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی تو نبھانی ہے نا۔ جو ہمارے بس میں ہے، بس ہم وہ کر دیں اور باقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت مانگیں۔ پھر پروردگار اپنی رحمت عطا فرما دیں گے۔

عزیز طلبا! آج کے دن اپنے دلوں میں عہد کر لیجیے کہ ہم گناہوں سے بچیں گے۔ یہ گناہوں کی آگ جو ہم اپنے جسموں پر روز جلاتے ہیں، عہد کر لیں کہ ہم نہیں جلائیں گے۔ کیونکہ یہ معصیت اللہ تعالیٰ سے دوری ہے۔ یوں سمجھیں کہ شیطان نے ہمیں سو رسیوں سے باندھا ہوا ہے، اب ہم نے ان میں سے جتنے گناہ چھوڑ دیے اتنی رسیاں توڑ دیں اور جو گناہ نہیں چھوڑے اتنی رسیوں میں ہم ابھی تک جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ الحمد للہ! مدارس کے اندر رہنے والے طلبا کی زندگی میں بہت

بڑے بڑے گناہ نہیں ہوتے۔کوئی پچانوے فیصد گناہ چھوڑ چکا ہوتا ہے کوئی چھیانوے فیصد اور ایک دو فیصد پہ آ کر کام اٹکا ہوتا ہے۔

☆......کسی کی نگاہ قابو میں نہیں،

☆......کسی کا دل قابو میں نہیں،

☆......کسی کی زبان قابو میں نہیں،

بس چند ایک گناہوں میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں اور باقی زندگی شریعت وسنت کے مطابق گزار رہے ہوتے ہیں، ان گناہوں کی وجہ سے بھی ان کے دلوں میں شرمندگی کا احساس ہوتا ہے، البتہ ان کو بھی چھوڑ کر اب ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ کا مصداق بن جانا چاہیے۔آپ یوں سمجھیے کہ آپ اٹھانوے رسیوں کو توڑ چکے ہیں اور صرف دو رسیاں باقی ہیں۔اب ان دو رسیوں سے آزادی حاصل کرنا تو بہت آسان ہے۔یا یوں سمجھیے کہ اللہ رب العزت تک پہنچنے کے لیے ہم نے سو قدم اٹھانے تھے، ان میں سے ہم نے اٹھانوے قدم اٹھا لیے، اب صرف دو قدم باقی ہیں، یہ دو قدم بھی اٹھا لیے تو منزل مل جائے گی۔اگر کوئی مسافر منزل سے دو قدم پہلے آ کر بیٹھ جائے اور منزل پر نہ پہنچ پائے تو اس پر کتنا افسوس ہوتا ہے! ؎

حسرت ہے اس مسافرِ مضطر کے حال پر
جو تھک کر رہ گیا ہو منزل کے سامنے

ہم بھی منزل کے سامنے ہیں اور ایک دو گناہوں کی وجہ سے منزل سے رکے ہوئے ہیں۔اب ان گناہوں کو بھی اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دیجیے۔اگر ہمارے لیے گناہوں کو چھوڑنا مشکل ہے تو ہم اللہ رب العزت سے دعا تو مانگ سکتے ہیں رو رو کر دعا مانگیں کہ اللہ! ہمیں گناہوں سے بچا لیجیے۔گناہوں کی ذلت سے ہمیں نکال لیجیے۔گناہوں کی دلدل سے نکال لیجیے۔جب ہم یہ دعا مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ رحمت

فرمادیں گے۔

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک بندے کو کھڑا کیا جائے گا، اس سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میرے بندے! تو نیک کیوں نہ بنا؟ تو وہ کہے گا: اللہ! میں دعائیں تو مانگتا تھا کہ تو مجھے نیک کردے، جب نامہء اعمال میں دعا موجود ہوگی تو اللہ تعالیٰ اسی کو ذریعہ بنا کر اس کی مغفرت فرمادیں گے۔ فرمائیں گے: ہاں! ہم سے دعائیں تو مانگتا تھا کہ اللہ! نیک بنا دے۔ ربّ کریم ہمارے لیے نیک بننا آسان فرمادے (آمین ثم آمین)

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿ اِنْ اَوْلِیَائُہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾
ورع وتقوی
بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم
بمقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اقتباس

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ایک لڑکے سے سوال پوچھا: بتاؤ! دین کا خلاصہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: ورع۔ یعنی احتیاط کے ساتھ دین پر عمل کرنا۔ پھر آپ نے فوراً دوسرا سوال پوچھا: دین میں مصیبت کیا ہے؟ اس نے کہا: طمع۔ یعنی ورع سے بہتر دین کا کوئی اور خلاصہ نہیں اور طمع سے بڑی کوئی مصیبت نہیں۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر فرمانے لگے کہ میں نے تجھ جیسا کوئی عقلمند نوجوان نہیں دیکھا کہ تو نے دو لفظوں میں پوری بات ہی سمیٹ دی۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

ورع وتقوی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ o ﴾ (المائدہ:۲۷)
وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى مَقَامٍ اٰخَرَ
﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ o ﴾ (الانفال:۳۴)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

ولایت کا حصول کیسے؟

ہر کلمہ گو انسان کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش ہوتی ہے کہ میں اللہ رب العزت کا ولی بن جاؤں۔ اس کے اعمال جیسے بھی ہوں، حالات جیسے بھی ہوں، مگر دل کی تمنا ضرور ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مجھے ولایت کا مقام مل جائے۔

ولایت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کو ولایتِ عامہ کہتے ہیں اور دوسری کو ولایت خاصہ کہتے ہیں۔ ولایت کلمہ پڑھ لینے پر آدمی کو نصیب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾

''اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے''

یہ ولایت کا پہلا قدم ہے اور یہ نعمت کلمہ پڑھ لینے پر انسان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جبکہ ولایت خاصہ وہ ولایت ہے جس کو ہم عرف میں ولایت کا نام دیتے ہیں۔ اس ولایت کے حصول کے لیے انسان کو تقویٰ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ اِنْ اَوْلِیَاءُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (الانفال:۳۴)

''اللہ کے ولی وہی ہوتے ہیں جو متقی ہوتے ہیں''

آج لوگوں میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بندہ ملنگ بن جائے، شاید وہ ولی بن جاتا ہے۔ عوام کالانعام یہ سمجھتے ہیں کہ...... آدھا ننگا آدھا ولی پورا ننگا پورا ولی...... ہرگز ایسا نہیں ہے۔ ولایت شریعت و سنت پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ مگر نفس یہ چاہتا ہے کہ من مرضی بھی کروں اور پھر بھی ولی بن جاؤں۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ کبھی ممکن نہیں کہ انسان کبائر کا مرتکب بھی ہو اور پھر اللہ کا ولی بھی ہو۔ دوستی اور دشمنی اکٹھی نہیں ہوتی۔ یا تو انسان ایک وقت میں دوست ہوتا ہے یا دشمن ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کی نافرمانی کرنا، یعنی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہونا، یہ اللہ رب العزت سے دشمنی ہے۔ اس لیے جو شخص یہ چاہے کہ مجھے ولایت کا منصب مل جائے، اسے چاہیے کہ وہ شریعت پر احتیاط کے ساتھ عمل کرے۔

یہ احتیاط کا لفظ کیوں استعمال کیا؟...... اس لیے کہ آدمی جب کسی کام کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے تو پھر وہ اس میں رسک نہیں لیتا۔ مثال کے طور پر آپ کی حج کی فلائٹ دس بجے ہے، تو آپ گھر میں کہیں گے کہ ہمیں ساڑھے نو بجے پہنچ جانا چاہیے۔ کیوں؟...... آپ رسک نہیں لینا چاہتے کہ ایسا نہ ہو کہ فلائٹ چلی جائے اور میں رہ

جاؤں۔انگریزی میں اسے کہتے ہیں:

To be on the safe side.

(محتاط رہ کر عمل کرنا)

گھر میں آپ بیوی سے کہتے ہیں کہ میں نے آج علما کو دعوت دی ہے۔دس بندے آئیں گے،لیکن To be on the safe side. آپ پندرہ بندوں کا کھانا تیار کر دیں۔کیونکہ اگر ایک دو بندے اور بھی آ جائیں تو شرمندگی نہ ہو۔

جس طرح دنیا کے کاموں میں آپ محتاط رہ کر عمل کرتے ہیں،اسی کو شریعت کی زبان میں ورع اور تقویٰ کہتے ہیں۔

ورع کی لغوی تحقیق:

ورع باب ضَــرَبَ سے ہے۔اس کے معنی ہیں کبیرہ کے ڈر سے صغیرہ کو چھوڑ دینا۔جیسے ہم کہتے ہیں کہ جس منزل پہ نہ جانا ہو اس کا راستہ پوچھنے کی کیا ضروری ہے۔اسی کو ورع کہتے ہیں کہ انسان بڑے گناہ سے بچنے کی خاطر چھوٹے گناہوں سے بھی بچے۔

نیکی کی پہچان:

دینِ اسلام،دینِ فطرت ہے۔اس دین کا سمجھنا بہت آسان ہے۔حتی کہ ان پڑھ بندہ جس کو ہم جاہل کہتے ہیں،وہ بھی دین سمجھ سکتا ہے۔اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے فطری سمجھ رکھی ہے۔چاہے اس کے پاس کتابی علم نہ ہو۔

نواس بن سمعان ﷺ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے نیکی اور بدی کی پہچان بتائی......اتنی آسان اور اتنی خوبصورت......سبحان اللہ!

ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ''نیکی اچھے اخلاق کا دوسرا نام ہے۔''چنانچہ ہر

بندے کو پتہ ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کیا ہیں۔

⊙......دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا،

⊙......خیر خواہی کرنا،

⊙......ہمدردی کرنا،

⊙......مصیبت میں ان کے کام آنا،

⊙......ایثار کرنا۔

ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ یہ اچھے کام ہیں۔اس کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ پہچان ہر بندے کو فطری طور پر حاصل ہے۔اسی لیے تو اس کو دین فطرت کہا گیا ہے۔ چنانچہ آپ جہاں بھی اچھے اخلاق دیکھیں گے، سمجھ لیں گے کہ یہ نیکی کا کام ہے۔

⊙......دوسرے سے مسکرا کر ملنا، خندہ پیشانی سے ملنا،

⊙......اس کے دکھ اور مصیبت کو بانٹ لینا،

⊙......اس کو تکلیف نہ پہنچانا،

⊙......اس کی جان، مال، عزت، آبرو کے اوپر بری نظر نہ رکھنا۔

کون ایسا بندہ ہے جو یہ نہیں جانتا کہ یہ اچھے اخلاق ہیں! چنانچہ جہاں آپ کا دل بتائے کہ میں اچھائی کا کام کر رہا ہوں، وہاں سمجھ لو کہ میں نیکی کا کام کر رہا ہوں۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ''گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو چاہے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔''

کئی مرتبہ ہم ایسا کام کرتے ہیں کہ اسے ہم دوسروں سے چھپاتے ہیں تاکہ کسی کو پتا نہ چل جائے۔ جب کام کرتے ہوئے دل میں یہ بات ہو کہ کہیں دوسروں کو پتا نہ چل جائے، تو سمجھ لیں کہ دل میں کچھ کالا ہے۔اس لیے فرمایا کہ اگر آپ کے پاس

موقع نہیں کہ آپ کسی عالم سے پوچھ لیں، تو اپنے دل پہ ہاتھ رکھ لیں۔ جب دل کو دھڑکتا پائیں اور دل چاہے کہ کسی کو پتا نہ چلے تو پھر سمجھ لیں کہ یہ گناہ کا کام ہے۔ یہ کس قدر آسان پہچان ہے! بکریوں کا چرانے والا، جس کی عمر ویرانے میں گزر جاتی ہے، اس کو علما کی صحبت میسر نہیں ہوتی، لیکن نیکی اور بدی کی پہچان اس کو بھی حاصل ہوتی ہے۔

تین انمول باتیں:

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جس کو تین باتیں حاصل ہوں، وہ سمجھ لے کہ مجھے دین کی ہر نعمت نصیب ہوگئی ہے۔

پہلی بات ......ایسا ورع جو اس کو حرام سے روک دے۔ **یعنی طبیعت کے اندر** ایسی احتیاط آجائے کہ انسان حرام کاموں سے بچ جائے۔ دل کی کیفیت ایسی ہو کہ وہ اس بات کا فیصلہ کر دے کہ میں نے اپنے پروردگار کو ناراض نہیں کرنا۔ جب ایسی کیفیت بن جائے گی تو وہ انسان گناہوں سے بچ جائے گا۔

دوسری بات ......ایسا وقار جو انسان کو جہالت کے کاموں سے روک دے۔ انسان کے اندر ایک وقار ہوتا ہے۔ جو اچھے لوگ ہوتے ہیں وہ باوقار زندگی گزارتے ہیں۔ وہ گھٹیا کام نہیں کرتے۔ وہ تنگی اور نقصان اٹھا لیتے ہیں، مگر وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو وقار کے منافی ہو۔ بہت سے دنیا دار لوگوں کو دیکھا کہ ان کی زندگی اتنی دین دارانہ نہیں ہوتی، مگر وہ باوقار ہوتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے کہا کہ اگر کوئی حافظِ قرآن ہے اور اس کے ساتھ کوئی بندہ جہالت کی باتیں شروع کر دے تو اس کو رک جانا چاہیے۔ اس لیے کہ...... **فِیْ جَوْفِہٖ کَلَامُ اللّٰہِ** (اس کے سینے میں اللہ کا قرآن ہے) یہ بھی ارشاد فرمایا:

مَا يَنْبَغِيْ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اَنْ يَّجْهَلَ مَعَ مَنْ جَهِلَ

''حافظِ قرآن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ جاہلوں کے ساتھ جاہلوں والی باتیں کرتا پھرے''

تیسری بات ......ایسے اخلاق جو انسان کو دوسرے کی دل آزاری سے روک دیں۔یعنی انسان کے اندر اتنی خوش اخلاقی ہو کہ وہ کسی دوسرے انسان کا دل نہ دکھائے۔ ہر وقت وہ اس بات پر نظر رکھے کہ میری وجہ سے اللہ کے کسی بندے کو تکلیف نہ ہو۔ ہمارے اکابر ایسے خوش اخلاق تھے کہ یوں لگتا تھا کہ جب وہ زمین پر چلتے تھے تو پاؤں آہستہ رکھتے تھے کہ پاؤں رکھنے سے زمین کو بھی تکلیف نہ پہنچے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ ہم دوسروں کا دل دکھاتے ہوئے گھبراتے بھی نہیں۔ یاد رکھیں! بیماریوں میں سے سب سے بری بیماری دل کی بیماری ہے اور دل کی بیماریوں میں سب سے بری بیماری دل آزاری ہے۔

مسجد ڈھادے مندر ڈھادے، ڈھادے جو کچھ ڈھیندا اے
پر کسے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا اے

چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں کا دل دکھانا، یہ مومن کا شیوہ نہیں ہوتا۔

تدبیر، پرہیز اور حسنِ خلق کی اہمیت:

طبرانی نے معجم کبیر میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ نبی علیہ السلام نے تین باتیں ارشاد فرمائیں۔

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی:

''تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں''

تدبیر کہتے ہیں، پلاننگ کرنے کو۔ یعنی ہم جو کام بھی کریں سوچ سمجھ کے

کریں۔ بعض انگریزی پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں کہ دینِ اسلام میں پلاننگ نہیں ہے...... کیوں نہیں ہے؟...... اللہ رب العزت کے محبوب ﷺ تو فرماتے ہیں کہ تدبیر سے بہتر کوئی عقل نہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ دینِ اسلام میں پلاننگ نہیں۔ عقلمند انسان ہمیشہ ترتیب اور تدبیر سے کام کرتا ہے۔ سوچ سمجھ کے کام کرتا ہے۔

دوسری بات ارشاد فرمائی:

''پرہیز سے بہتر کوئی ورع نہیں۔''

جو بندہ پرہیز اور احتیاط کے ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کرتا ہے وہ دنیا میں بھی خوشیوں بھری زندگی بسر کرتا ہے اور اسے آخرت میں بھی اللہ رب العزت کی رضا نصیب ہوگی۔

پھر تیسری بات ارشاد فرمائی:

''اچھے اخلاق سے بہتر کوئی نسب نہیں۔''

جس انسان کو اللہ رب العزت نے حسنِ خلق عطا فرما دیا، وہ سمجھ لے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بہترین حسب و نسب عطا کر دیا۔

دو لفظوں میں بات......

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ایک لڑکے سے سوال پوچھا: بتاؤ! دین کا خلاصہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: ورع۔ یعنی احتیاط کے ساتھ دین پر عمل کرنا۔ پھر آپ نے فوراً دوسرا سوال پوچھا: دین میں مصیبت کیا ہے؟ اس نے کہا: طمع۔ یعنی ورع سے بہتر دین کا کوئی اور خلاصہ نہیں اور طمع سے بڑی کوئی مصیبت نہیں۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر فرمانے لگے کہ میں نے تجھ جیسا کوئی عقلمند نوجوان نہیں دیکھا کہ تو نے دو لفظوں میں پوری بات ہی سمیٹ دی۔

دینِ اسلام کا نچوڑ:

سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ چار باتیں دینِ اسلام کا نچوڑ ہیں۔

- ......ورع تمام معاملات کی اصل ہے۔
- ......تواضع مومن کے لیے باعثِ عزت ہے۔
- ......جو شخص خوشحالی میں شکر ادا کرتا ہے تو یہ شکر اسے جنت میں لے جاتا ہے۔
- ......جو شخص تنگ دستی میں صبر کرتا ہے تو یہ صبر اسے جہنم سے بچا لیتا ہے۔

آدمی کے اندر یہ چاروں صفات ہونی چاہییں۔ شریعت پر چلنے میں بہت احتیاط کرے، عام حالات میں ایمان والوں کے درمیان تواضع سے زندگی گزارے، خوش حالی میں اللہ کا شکر ادا کرے اور تنگ دستی میں صبر کرے۔

تین حیران کن باتیں:

یونس بن عبید فرمایا کرتے تھے کہ زندگی میں تین باتوں نے مجھے حیران کر دیا:

(۱)......ان کے ایک دوست محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جنہوں نے تعبیر الرؤیا کتاب لکھی۔ وہ ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ "میں نے کبھی دنیا کی خاطر کسی سے حسد نہیں کیا۔" کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اچھا! دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو دنیا کی خاطر کسی سے حسد نہیں کرتے۔

(۲)......حسان بن ابی سنان ان کے دوست تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ورع بہت آسان ہے۔ پوچھا: وہ کیسے؟ کہنے لگے: اس طرح کہ "جب تیرے دل میں کوئی بات کھٹکے تو تُو اس کو چھوڑ دے، تو ورع پر عمل کرنے والا بن جائے گا۔" انسان اگر سوچے تو واقعی یہ بات سو فیصد ٹھیک ہے کہ ہر وقت یہ نظر رہے کہ کون سا کام اللہ کو

راضی کرنے کا باعث بن سکتا ہے اور کون سا کام اللہ تعالیٰ کو ناراض کر سکتا ہے۔ بندہ جب ناراض کرنے والا کام کرے گا تو وہ گھبرائے گا اور چاہے گا کہ میں اسے چھپاؤں۔

ہم کئی مرتبہ ایسے کام کرتے ہیں کہ دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ کو پتہ بھی نہیں چلنے دیتے۔ اس قسم کے سارے گناہ ہی ہوتے ہیں۔ شریعت نے تو کہا کہ صدقہ ایسے دو کہ دائیں ہاتھ سے صدقہ دو تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے اگر کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنا ہوتا ہے تو ارادہ بھی بتا دیتے ہیں۔ ہمارے اکابر نیک کام کو اس کے کرنے کے بعد چھپاتے تھے اور ہم نے کام کیا نہیں ہوتا، جب کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس ارادے کا بھی اظہار کر دیتے ہیں۔

ورع کے درجات:

ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ ورع کے چار درجات ہیں:

(۱)......عوام الناس کا ورع۔ وہ یہ ہے کہ انسان حرام کاموں سے بچے۔

(۲)......صالحین کا ورع۔ وہ یہ ہے کہ انسان مشتبہ (شبہ والے) کاموں سے بچے۔

(۳)......متقین کا ورع۔ وہ یہ ہے کہ حرام کے خوف سے حلال کو بھی چھوڑ دے۔

(۴)......صدیقین کا ورع۔ وہ یہ ہے کہ ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو اللہ کے لیے نہ ہو۔

احتیاط سے عمل کرنے کا مطلب:

اب احتیاط سے عمل کرنے کا کیا مطلب ہے؟......ذرا یہ بھی سن لیجیے۔

عام طور پر بازار کے اندر جو کھانے بنتے ہیں، ان کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا کہ بنانے والے نے چیزیں صحیح ڈالیں یا نہیں۔ پاکی اور ناپاکی کا خیال رکھا یا نہیں رکھا اور خاص طور پر جو ملٹی نیشنل ریسٹورنٹ بن چکے ہیں، ان کے بارے میں تو کچھ بھی

نہیں کہہ سکتے کہ وہ اندر کیا ڈالتے ہوں گے! چنانچہ اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ کوئی حرام چیز نہ اندر چلی جائے۔ لہٰذا اگر کوئی بندہ اس نیت سے ایسے ریسٹورنٹ کا کھانا چھوڑ دے گا تو یہ ورع کہلائے گا...... احتیاط ہے...... ہم اس چیز پر حرام کا فتویٰ بھی نہیں لگا سکتے کیونکہ ہمیں کیا پتا کہ اس میں کیا ڈالا ہوا ہے۔ مگر احتیاط اسی میں ہے کہ ایسی چیزوں کو مت کھائیں۔ سلوک سیکھنے والے لوگ اپنے گھروں میں ایمان والی، نماز پڑھنے والی عورتوں کے بنے ہوئے پاکیزہ کھانوں پر ہی اکتفا کرلیں تو یہی بہتر ہے۔ ہاں، اگر سفر میں ہوں یا کوئی ایسی وجہ ہو تو شریعت عذر قبول کر لیتی ہے۔ پھر بے شک بازار کی بنی ہوئی چیز کھالیں۔ مگر ورع یہی ہے کہ بازار کی چیز نہیں کھانی۔

دوسری مثال: انسان بازار میں سے گزرتا ہے۔ وہاں مرد بھی ہوتے ہیں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر وہ نظر اٹھا کر لوگوں کو دیکھے گا تو دونوں احتمال موجود ہیں۔ وہ نظر مرد پر بھی پڑ سکتی ہے اور عورت پر بھی...... اب حرام سے بچنے کی نیت سے جو بندہ اپنی نظر جھکائے ہی رکھے، اوپر نہ اٹھائے، تو یہ ورع پر عمل کرنے والا بندہ ہوگا۔ یعنی عورتوں کے چہروں کو تو کیا دیکھنا، مردوں کے چہروں کو بھی نہ دیکھے۔

بیداری کی زندگی کیسے؟

یہ چیز ذہن میں رکھ لیں کہ جس شخص کے دل میں دنیا کی محبت ہو، اس کے دل میں ورع داخل نہیں ہوسکتا۔ جب انسان فیصلہ کر لے کہ میں نے اللہ رب العزت کے لیے زندگی گزارنی ہے تو پھر اس کے لیے ورع پر عمل کرنا آسان ہوگا۔ کیونکہ اسے خلاف شرع کام چھوڑنا آسان لگے گا۔ یہ بندے کی بیداری ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اکثر و بیشتر انسان نیند میں وقت گزار رہا ہوتا ہے...... عیش میں ...... آرام میں...... زندگی گزر رہی ہوتی ہے۔ بیداری کی زندگی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک انگریز نے کتاب میں ایک عجیب بات لکھی۔ وہ

کہتا ہے:

"Suddenly I realised that the days coming and going are my life."

''اچانک مجھے احساس ہوا کہ جو دن آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں، یہی میری زندگی ہے''

چنانچہ بندہ یہ سوچے کہ میں نے اپنے پروردگار کو ناراض نہیں کرنا۔ جبکہ آج ہماری حالت یہ ہے کہ شادی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ

...... ماموں کو بھی مناؤ،

...... چچا کو بھی منالو،

...... پھوپھو کو بھی منالو،

...... خالہ کو بھی منالو،

...... ہمسائی ناراض ہوگئی تھی، بیوی کہتی ہے کہ اسے بھی منالو،

...... ڈرائیور ناراض ہوگیا تھا، بھئی! شادی کا موقع ہے اسے بھی منالو،

...... گھر میں کام کرنے والی خادمہ، وہ بھی ناراض ہوگئی ہو تو عورتیں پیغام بھیج دیتی ہیں کہ اس کو بھی منالو۔

اب آپ سوچیں کہ گھر میں کام کرنے والی عورت کو بھی اس وقت منایا جاتا ہے، مگر شادی شرع کے خلاف کر کے اپنے رب کو اور اس کے محبوب کو ناراض کیا جا رہا ہوتا ہے...... کیا گھر کی ماسی اور ڈرائیور کے برابر بھی مقام نہ دیا!...... یہ بھی تو سوچتے کہ کیا اس طرح شادی کرنے سے اللہ رب العزت بھی خوش ہوں گے یا نہیں ہوں گے۔

افراط وتفریط سے بچیں:

ورع پر عمل کرتے وقت افراط وتفریط سے بچنا چاہیے۔ شیطان احتیاط سے عمل

کرنے والوں کو کئی مرتبہ اتنا سخت بنا دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے دل بھی دکھا دیتے ہیں۔امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ عنہ ایسے بندے کو" وَدِعٌ مُّظلِمٌ"(اندھا متورع) کہتے تھے۔چنانچہ اس بات کا خیال رکھیں۔میانہ روی زیادہ بہتر ہے۔

تقویٰ کی لغوی تحقیق:

ورع اور تقویٰ ملتے جلتے الفاظ ہیں۔معانی کے اعتبار سے ان میں تداخل ہے۔ تقویٰ اصل میں اِتَّقٰی سے اسمِ مصدر ہے۔مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ تقویٰ اسم مصدر ہے اور وقایہ اس کا مصدر ہے، چنانچہ یہ وقوای سے بنا ہے۔پھر داؤ کو تا سے بدل دیا تو یہ تقویٰ بن گیا۔جیسے تَرَاث میں یا تُخمہ میں واؤ کو تا سے بدل دیا۔

تقویٰ کا مطلب ہے آڑ لینا۔قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یَتَّقِی بِجُذُوعِ النَّخلِ (درخت کے تنے کی آڑ لینا)

یعنی اپنے آپ کو گناہوں سے بچالینا،تقویٰ کہلاتا ہے۔

ہمارے اکابر نے تقویٰ کے بارے میں مختلف اقوال ارشاد فرمائے ہیں، مثلاً:

◉ ......سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی بندہ تقویٰ کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس چیز کو نہ چھوڑ دے جو اس کے دل میں کھٹکے۔

◉ ......وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ متقی وہ ہے جو دوسروں کو اپنے سے اعلیٰ سمجھے۔

◉ ......بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ متقی وہ ہے جو ہر کام اللہ رب العزت کی رضا کے لیے کرے۔

◉ ......ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ متقی وہ ہے جو دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔

◉ ......سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ متقی وہ ہے جو گناہوں پہ اصرار نہ کرے۔یعنی بار

بار گناہ نہ کرے۔ اگر گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ کے ذریعے اپنے پروردگار سے معافی مانگ لے۔

معاملات میں تقویٰ کا پہلو:

تقویٰ کا تعلق فقط کھانے پینے سے نہیں ہے، بلکہ پوری زندگی کے ساتھ ہے۔ کھانے پینے کا تقویٰ بہت آسان ہوتا ہے۔ تو معاملات ایسے رکھنا کہ دوسرے بندے کا دل نہ دکھے اور اس کی حق تلفی نہ ہو۔ معاملات کے اندر تقویٰ کا خیال رکھنا، یہ مشکل کام ہوتا ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرؓ سے یہ روایت کی ہے کہ کسی بندے کا فقط نماز روزہ مت دیکھو، بلکہ اس کے معاملات کو دیکھا کرو۔ ہمارے اکابر اپنے معاملات میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ مثال کے طور پر:

⊙......امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جوانی کی عمر میں کپڑے کی دکان چلاتے تھے۔ ایک دن ظہر کے بعد دکان بند کر کے گھر آ رہے ہیں۔ کسی نے پوچھا: جی آپ نے ابھی سے دکان بند کر دی؟ فرمایا: ہاں! آج آسمان پر بادل ہیں، روشنی پوری نہیں، اور جب روشنی پوری نہیں ہوتی تو گاہک کو کپڑے کی کوالٹی کا صحیح پتا نہیں چلتا۔ میں نے اس لیے دکان بند کر دی کہ کوئی گاہک کم قیمت کپڑے کو بیش قیمت کپڑا سمجھ کر دھوکے میں نہ پڑ جائے۔

⊙......ان کے پاس کپڑے کا ایک ایسا تھان آیا جس کے اندر بناوٹ میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی دکان پر کام کرنے والے ورکرز سے کہا کہ جب بھی تم نے یہ تھان بیچنا ہے تو گاہک کو بتا دینا کہ اس کے اندر یہ کمی ہے۔ اس نے کہا: جی بہت اچھا۔

ایک دن جب آپ آئے تو وہ تھان نہ پایا۔ ورکرز سے پوچھا: کیا وہ بک

گیا ہے؟ کہنے لگا: جی ہاں۔ پھر پوچھا: کیا گاہک کو اس کا عیب بھی بتا دیا تھا؟ اس نے کہا: جی میں تو بھول ہی گیا۔ فرمانے لگے اب میرے لیے اس پیسے کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ ایک عیب دار چیز کو وہ ہم سے اچھا سمجھ کر لے گیا...... ایک مومن کی تجارت دیکھیے ۔...... پوچھا: کتنے میں بیچا؟ اس نے بتایا: اتنے میں بیچا۔ فرمایا: پیسے لاؤ۔ پھر پوچھا: کیسا بندہ تھا؟ اس نے کہا: اتنا قد تھا، ایسے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس طرف کو گیا تھا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اس کے پیچھے چلے۔ اسے ڈھونڈا تا کہ وہ بندہ مل جائے اور میں اسے پیسے واپس کر دوں یا بتا دوں کہ اس میں یہ عیب تھا، اگر منظور ہے تو بے شک خرید لو۔ چنانچہ پوچھتے پوچھتے شہر کے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہاں وہ بندہ مل گیا۔ حضرت اسے جا کر ملے اور اس کو جا کر کہا: آپ نے ہماری دکان سے یہ کپڑا خریدا، وہاں پر موجود نوجوان بھول گیا، اس نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ اس کے اندر عیب ہے۔ اس نے یہ بات سنی تو بڑا حیران ہوا۔ چنانچہ اس نے کہا: جی آپ میرے پیسے واپس کر دیں۔ اس نے جو پیسے دیے تھے آپ نے وہ واپس کر دیے۔ قریب ہی پانی کا ایک جوہڑ تھا، اس نے وہ پیسے لے کر اس جوہڑ میں پھینک دیے۔ اب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ اس نے پیسے لیے اور جوہڑ میں پھینک دیے۔ چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: بھئی! تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کہنے لگا کہ میں بدنیت انسان دھوکہ دینے کے لیے آیا تھا اور کھوٹے سکے لے کر آیا تھا، لیکن جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ کے اندر تقویٰ اتنا ہے کہ چھوٹی سی بات بتانے کے لیے آپ نے شہر کے کنارے تک مجھے تلاش کیا، میرے دل نے ملامت کی کہ تو اس کو دھوکہ نہ دے، چنانچہ اب میں آپ کو صحیح اور کھرے پیسے دیتا ہوں۔

◉......ہمارے اکابر کے حالاتِ زندگی میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جب وہ بیٹی کا رشتہ کرتے تھے، اگر بیٹی میں کوئی بری عادت ہوتی تھی تو رشتہ مانگنے والوں کو اس کے بارے میں بھی بتا دیا کرتے تھے......اس کو غصہ آتا ہے......کام میں ست ہے...... ایسی باتیں بچوں میں ہوتی ہیں۔ وہ بیٹی کی بات کو بھی کھول دیتے تھے تاکہ دوسرے بندے کو دھوکا نہ ہو۔

◉......ایک آدمی گدھا بیچ رہا تھا۔ خریدار نے پوچھا: بھئی! یہ گدھا کیسا ہے؟ اس نے جواب دیا: اگر یہ مجھے پسند ہوتا تو کیوں بیچتا؟ کیسے سیدھے لوگ ہوتے تھے۔ سبحان اللہ!

◉......ہمارے اکابر تو انسانوں کی حق تلفی تو کجا، جانوروں کے حقوق میں بھی کمی بیشی کرنے سے گھبرایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابو درداؓ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ اپنے اونٹ کو چارہ ڈالنے لگے تو چارہ ڈالتے ہوئے فرمانے لگے: دیکھ! میں نے کبھی تیری ہمت سے زیادہ تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا، تو قیامت کے دن میرے ساتھ جھگڑا نہ کرنا......اللہ اکبر کبیرا......یہ اولیا ہوتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے سینوں کو اللہ نے ولایت کے نور سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

گناہ چھوڑنے کی فضیلت:

ورع اور تقویٰ کا مقصود یہ ہے کہ انسان شریعت پر احتیاط سے عمل کرے اور گناہوں سے بچے۔ چنانچہ حدیث مبارکہ میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ

''تو گناہ کرنا چھوڑ دے، سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ بن جائے گا''

ایک ہوتا ہے دوڑ دوڑ کر نفلیں پڑھنا، تسبیح پھیرنا، نمازیں پڑھنا، یہ بہت اچھی

بات ہے۔اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ انسان کے وجود سے اللہ کی کوئی نافرمانی نہ ہو۔اس پر زیادہ محنت کرنی چاہیے۔سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

''بہترین عمل جسے لے کر انسان قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہوگا وہ گناہوں کی کمی ہے۔''

اس امت میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو گناہ نہیں کرتے تھے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عورت کا تذکرہ کیا ...... اَلْمَرْءَۃُ الْمُتَکَلِّمَۃُ بِالْقُرْآنِ ...... وہ عورت جو قرآن کے الفاظ اور آیات سے گفتگو کا جواب دیتی تھی۔وہ کوئی دوسرا لفظ زبان سے نکالتی ہی نہ تھی کہ میری زبان سے جھوٹ، غیبت یا کوئی خلافِ شرع بات نہ نکل جائے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں:

''اس امت میں ایسی پاک ہستیاں بھی گزری ہیں کہ ان کے گناہ لکھنے والے فرشتے کو بیس بیس سال تک کوئی گناہ لکھنے کا موقع نہیں ملا۔''

اس کا کیا مطلب؟ ...... کہ وہ فرشتے تھے؟ ......نہیں! وہ انسان ہی تھے۔اول تو وہ گناہ کرتے ہی نہیں تھے اور بتقاضائے بشریت کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جاتا تو فوراً توبہ کرتے تھے۔چونکہ حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو نیکی والا فرشتہ گناہ لکھنے والے فرشتے کو روکتا ہے کہ ٹھہر جاؤ! ممکن ہے کہ یہ توبہ کر لے اور لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔وہ اسے ایک پہر تک روکتا ہے۔چنانچہ اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو انسان فوراً نادم اور شرمندہ ہو جائے، گناہ لکھا ہی نہیں جائے گا۔کیا خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جن کے نامہءاعمال میں بیس بیس سال تک گناہ لکھنے والے فرشتے کو گناہ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا۔

حسن بصری فرماتے ہیں:

''مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْوَرَعِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ مِثْقَالٍ مِّنَ الصَّوْمِ وَالصَّلٰوةِ''

''ایک حصہ گناہ کا چھوڑ دینا بہتر ہے اس سے کہ انسان ہزار حصے نیکی، نماز اور روزے کے کرے''

بزرگوں نے کہا:

''آدمی پانچ سو مرتبہ حج کرے، اس سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ ایک گناہ کو اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دے۔''

ہمارے اکابر نے فرمایا:

''ایک ذکر تو یہ ہے کہ انسان زبان سے اللہ اللہ کرے۔ دل میں اللہ اللہ کا دھیان رکھے۔ لیکن بہترین ذکر یہ ہے کہ بندے کو گناہ کرنے کے وقت اللہ یاد آجائے اور وہ گناہ کو اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دے۔''

یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ جب بھی بندہ اللہ رب العزت کی رضا کے لیے کوئی چیز چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کا بہتر نعم البدل عطا فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بندہ غیر محرم سے نظر ہٹاتا ہے تو حدیث مبارکہ میں ہے کہ اس نظر ہٹانے پر اللہ اس کو عبادت میں لذت اور ایمان کی حلاوت عطا فرما دیتے ہیں۔ تو بہتر چیز مل گئی نا؟

علوم ومعارف کی بارش:

جو بندہ تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو علوم ومعارف عطا فرماتے ہیں۔ طلبا متوجہ ہوں کہ اگر ان کا دل چاہے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے ہمیں اسرار ورموز ملیں، ہمارے دل میں معارف اتریں، تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ گناہ کو ہمیشہ

کے لیے خیر آباد کہہ دیں۔اس کی دلیل قرآن عظیم الشان سے...... اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ﴾ (البقرة:۲۸۲)

''اور اللہ سے ڈرتے رہنا، اللہ تعالیٰ تمہیں علم عطا فرمائے گا''

تو جو انسان ورع اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے براہ راست علم عطا فرماتے ہیں۔اس کو علمِ لدنی کہتے ہیں۔

تقویٰ کی بدولت اجر میں اضافہ:

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں اور دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند الفردوس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔فرماتے ہیں:

رَكْعَتَانِ مِنْ رَجُلٍ وَرِعٍ اَفْضَلُ مِنْ اَلْفِ رَكْعَةٍ مِّنْ مُخَلِّطٍ

''متقی آدمی کی دو رکعتیں مخلط بندے کی ہزار رکعتوں پر بھی فضیلت رکھتی ہیں۔''

متقی بندے کو دو رکعت پر وہ اجر ملتا ہے جو عام بندے کو ہزار رکعت پر بھی نہیں ملتا۔اور مخلط بندہ وہ ہوتا ہے جو نیک اعمال کے ساتھ گناہوں کو بھی خلط ملط کرنے والا ہو۔

یہ تقویٰ کی برکت ہے کہ اس کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴾ (الطلاق:۵)

(اور وہ تمہارے اجر کو بہت زیادہ کردے گا)

دیکھیں! ایک من مٹی ایک من ہوتی ہے۔

ایک من لوہا ایک من ہوتا ہے۔ اور

ایک من سونا ایک من ہوتا ہے۔

ایک من مٹی کی قیمت اور ہوتی ہے اور ایک من لوہے کی قیمت اور ہوتی ہے اور ایک من سونے کی قیمت اور ہوتی ہے۔ عام آدمی کے عمل پر اگر مٹی اور لوہے کی قیمت لگائیں گے تو اللہ تعالیٰ متقی بندے کے اعمال پر سونے کی قیمت لگا دیں گے۔ اور کئی ایسے بھی ہوں گے جن کے عملوں کو مٹی کے بھاؤ بھی قبول نہیں فرمائیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''جو شخص اتنی ورع نہیں رکھتا کہ تنہائی میں نافرمانی سے بچے، وہ جو چاہے کرے اللہ تعالیٰ کو اس کے عمل کی کوئی پروا نہیں۔''

اللہ رب العزت سے یہ نعمت مانگیے کہ اللہ رب العزت ہمیں تنہائی میں گناہوں سے بچنے کے لیے اپنا خوف عطا فرما دے۔

حاصلِ کلام:

یاد رکھیں! اگر اسی طرح ملی جلی زندگی رہی کہ ضربیں بھی لگتی رہیں اور گناہ بھی ہوتے رہے تو پھر ہم نفس کے چنگل میں پھنسے رہیں گے۔ پھر ولایت کا نور دل میں آنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے دل میں یہ نیت کر لیجیے کہ آج کے بعد ہم کوئی ایسا عمل نہیں کریں گے جو ہمارے پروردگار کو ناراض کر دے۔ نیت پر ہی عمل کی بنیاد ہوتی ہے۔ دنیا کا سب سے لمبا سفر ایک قدم اٹھانے سے شروع ہو جاتا ہے۔ آپ یہ نیت کر لیں، ولایت کا سفر شروع ہو جائے گا۔ آپ کی خدمت میں ولایت حاصل کرنے کا طریقہ بتلا دیا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں فارسی کا ایک شعر کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے دوست! میں نے تجھے منزل کا پتہ بتا دیا، میں نہیں پہنچ سکا، ہوسکتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ تجھے پہنچا دے۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں موت سے پہلے ولایت کا نور عطا فرمادے اور قیامت کے دن اپنی محبت کرنے والے عشاق کی قطار میں ہمیں بھی کھڑا فرمادے۔ آمین ثم آمین

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ﴾ (النحل:٩٧)
کامیابی کے
پانچ اصول
بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی
دامت برکاتہم

اقتباس

یہ پانچ ایسی غلطیاں ہیں جو اکثر و بیشتر ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ تفصیل تو بہت ہوتی ہے مگر یہ بنیادی باتیں ہیں۔ اگر ہم اس بنیاد کو ٹھیک کر لیں تو ہماری زندگی کی ترتیب درست ہو جائے۔ آج کے نوجوان بھی آ کر کہتے ہیں، حضرت! ہمیں کوئی مختصر سی نصیحت کر دیں۔ تو دل میں بات آئی کہ اج آپ کے سامنے پانچ ایسی باتیں کھولی جائیں کہ اگر آپ کو کبھی کہیں نصیحت کرنی پڑے تو یہ پانچ باتیں بیان کر دیں۔ یہ اس عاجز کی زندگی کا نچوڑ سمجھ لیں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

کامیابی کے پانچ اصول

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۝ ﴾ (النحل:۹۷)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

وعدۂ خداوندی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُمْ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ (النحل:۹۷)
’’جس نے بھی نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت ہو، ایمان والا ہو، ہم ضرور بالضرور اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے‘‘

اس آیتِ مبارکہ میں ہمارے لیے بڑے سچے کی بات ہے۔ فطری طور پر ہر انسان کامیاب زندگی کے حصول کے لیے، دن رات محنت اور کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اللہ رب العزت اس بات کو بہت ہی واضح لفظوں میں سمجھا رہے ہیں کہ ایمان والا ہو اور مرد ہو یا عورت ہو اگر وہ نیک عمل کرے تو ہم ضرور بالضرور اسکو پاکیزہ زندگی عطا

کر دیں گے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہماری کامیابی کا مدار ہمارے اعمال پر ہے۔اگر اعمال اچھے ہوں گے تو زندگی کامیاب ہوگی اور اگر اعمال بگڑ جائیں گے تو زندگی ناکام ہوگی۔

زندگی کا نچوڑ:

اکثر لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ہماری پریشانیاں دور ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ ہمارے اندر سے یہ برائیاں کیوں نہیں نکل رہیں؟ ہم ٹھیک کیوں نہیں ہو رہے؟...... ان سب سوالوں کا جواب یہ ہے کہ پانچ بنیادی باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ہمیں زندگی میں ناکامی ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے ہم پریشان رہتے ہیں، وہ پانچ باتیں آپ کو بتانے کا ارادہ ہے۔جیسے کہتے ہیں کہ...... ''سو باتوں کی ایک بات''...... اسی طرح ان کو بھی زندگی کا نچوڑ سمجھیں۔اگر ہم اپنے اندر سے ان پانچ کوتاہیوں کی اصلاح کر لیں تو ہماری زندگی کامیاب ہو سکتی ہے۔یہ پانچ ایسی غلطیاں ہیں جو اکثر و بیشتر ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔تفصیل تو بہت ہوتی ہے مگر یہ بنیادی باتیں ہیں۔اگر ہم اس بنیاد کو ٹھیک کر لیں تو ہماری زندگی کی ترتیب درست ہو جائے۔آج کے نوجوان بھی آ کر کہتے ہیں، حضرت! ہمیں کوئی مختصر سی نصیحت کر دیں۔تو دل میں بات آئی کہ آج آپ کے سامنے پانچ ایسی باتیں کھولی جائیں کہ اگر آپ کو کبھی کہیں نصیحت کرنی پڑے تو یہ پانچ باتیں بیان کر دیں۔یہ اس عاجز کی زندگی کا نچوڑ سمجھ لیں۔

(۱) علم پر عمل کرنا

ان میں سے سب سے پہلی کوتاہی یہ ہے کہ ہم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔شاید ہمارے نوجوانوں نے علم پر عمل کو علما کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے، یہ بہت بڑی غلطی

ہے۔ ہر انسان کے پاس کچھ نہ کچھ علم ہوتا ہے اور ہر آدمی اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل کرے۔ ہمارا یہ سمجھ لینا کہ علما علم پر عمل نہیں کرتے، یہ عذر لنگ کی مانند ہے۔ قیامت کے دن ہر بندے سے یہ سوال پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟

ہم جو علم پر عمل نہیں کرتے اس میں فقط دین ہی کی بات نہیں، دنیا کے معاملے میں بھی یہی حال ہے چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

علم کے ہوتے ہوئے بے صبری:

ایک بندہ جس نے ڈبل ایم اے کیا ہوتا ہے گویا اس نے دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوتی ہے۔ وہ اگر گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے اور سامنے ریلوے پھاٹک بند ہے اور کچھ گاڑیاں لائن میں کھڑی ہوتی ہیں۔ اب اس کو معلوم ہے کہ جب تک ریل گاڑی نہیں گزر جائے گی اس وقت تک ٹریفک نہیں کھلے گی۔ لیکن وہ کھڑی گاڑیوں کی لائن چھوڑ کر آنے والی لائن کے اوپر آگے جا کر گاڑی کھڑی کر دیگا اس کی اعلیٰ تعلیم نے اس کو کیا فائدہ دیا؟...... یہ نہیں کہ اس کو سمجھ نہیں ہے، اس کو پتہ ہے، اسے یہ بھی پتہ ہے کہ جب تک ٹریفک نہیں چلے گی تب تک میری گاڑی بھی آگے نہیں جائے گی...... نتیجہ کیا ہوتا ہے؟...... کہ جب پھاٹک کھلتا ہے تو ادھر بھی دونوں طرف گاڑیاں ہوتی ہیں اور ادھر بھی اب ہارن بج رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو غصے کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ خواہ مخواہ ایسا کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے اندر اتنا صبر بھی نہیں ہوتا کہ ہم اسی لائن میں ایک جگہ کھڑے ہو جائیں۔ اور یہ سوچ لیں کہ جب پھاٹک کھلنے پر ٹریفک چلے گی تو ہم بھی چل پڑیں گے۔ اب دیکھیے کہ علم پر ہمارا عمل کتنا کمزور ہے کہ جاننے کے باوجود ہم مسئلے کو الجھا رہے ہوتے ہیں!

علم کے باوجود ڈسپلن میں کمزوری:

ڈرائیونگ میں تو ہم اتنی غلطیاں کرتے ہیں کہ کوئی حد ہی نہیں۔ اچھا بھلا سمجھدار بندہ (جو اپنے دفتر میں افسر کہلاتا ہے وہ) بھی ریڈ لائٹ کو کراس کرنا کوئی بری بات نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یہ اصول اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ آدمی خود بھی آسانی میں رہے اور دوسروں کے لیے بھی آسانی کا سبب بنے۔ مگر کوشش یہ ہوتی ہے کہ بس ہم چلتے رہیں۔ سامنے ریڈ لائٹ آجاتی ہے اور اسی طرف کی ٹریفک چل رہی ہوتی ہے اور دوسرے کھڑے رہتے ہیں۔ بس ایسے۔ ہی تماشا بنا ہوتا ہے...... کس لیے؟...... کہ ہمارے اندر ڈسپلن نہیں ہے۔ ہم ایک چیز کو اچھا تو سمجھتے ہیں مگر اس چیز کو اپناتے نہیں ہیں اور یوں ہم اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ تو اس علم کو فقط علما اور طلبا کے ساتھ مخصوص کر دینا یہ شیطان کا بڑا دھوکا ہے۔ ہر بندہ اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھے کہ میں اپنے علم پر کتنا عمل کرتا ہوں؟

جاننے کے باوجود ہوس بھری نظریں:

کتنے نوجوان ہیں جن کو معلوم ہے کہ غیر کی عزت کی طرف نظر اٹھانا بری بات ہے اور وہ کبھی برداشت نہیں کرتے کہ ان کی گھر کی عورتوں کی طرف کوئی بری نظر اٹھائے۔ لیکن جہاں اپنا معاملہ ہوتا ہے وہاں ٹیلیفون پر باتیں بھی ہو رہی ہوتی ہیں، میسج بھی دیے جا رہے ہوتے ہیں، گھنٹوں کسی کی خاطر وقت بھی صرف کیا جا رہا ہوتا ہے اور پھر اس کو پتہ بھی ہوتا ہے کہ میں برا کام کر رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی لگا ہوتا ہے۔ مرد بھی، عورت بھی۔ وہ جانتے بھی ہیں کہ یہ ایک بری بات ہے لیکن نفس کی خواہش کے پیچھے ہم اس برائی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ وہی بات جب اپنے اوپر آتی ہے تو ہم برا سمجھتے ہیں لیکن جب دوسروں کی عزت کا مسئلہ ہو تو بری نظر اٹھ

رہی ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔

ماں باپ کی ناقدری:

آج کونسا نوجوان ہے کہ جس کو پتہ نہیں کہ اپنے والدین کی خدمت کرنی چاہیے، فرمانبرداری کرنی چاہیے اور ان کو دنیا کے اندر سکھ پہنچانا چاہیے۔ لیکن کتنے نوجوان ہیں جو ماں باپ کی بات مانتے ہیں؟ ماں باپ اگر کسی بات پر روکتے ٹوکتے ہیں تو وہ انہی کے فائدے کی خاطر ایسا کرتے ہیں، مگر آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بس مجھے تو اپنے دوست کے ساتھ بائیک پر جانا ہے۔ حالانکہ باپ منع کر رہا ہوتا ہے، بیٹا! یہ اچھا بچہ نہیں ہے، یہ پڑھتا بھی نہیں، یہ کام بھی نہیں کرتا اور سارا دن فارغ رہتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ تمہاری دوستی اچھی نہیں۔ مگر باپ کی بات وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں اور پھر اسی کے ساتھ جارہے ہوتے ہیں، یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہے۔

پانی کی ناقدری:

کس کو پتہ نہیں کہ اللہ کی نعمت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے مگر پانی کی ٹونٹی کھول دیتے ہیں اور برش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب جو پانی گر رہا ہوتا ہے وہ کس کھاتے میں جاتا ہے۔ یہ بندہ ویسے انجینئر بھی ہے اور ڈاکٹر بھی ہے مگر اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت کو ضائع بھی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک نعمت ہے۔ اور ہونا تو یہ چاہیے کہ

Use it, Do not abuse it.

(اسے استعمال کریں ضائع نہ کریں)

پانی نالی میں جارہا ہوتا ہے اور ہم اس کی پرواہی نہیں کرتے۔ ہمیں برش کرتے وقت اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اس کو اس وقت بند کر دیں۔ یہ کتنی چھوٹی سی بات

ہے۔اب آپ اپنے آپ کو اس کسوٹی پر ہر وقت تولنے کی کوشش کریں کہ میں اپنے علم
پر کتنا عمل کر رہا ہوں؟ اگر ہم دنیا میں اس کا جواب نہیں دے سکتے تو سمجھ لیں کہ ہم
قیامت کے دن بھی جواب نہیں دے سکیں گے۔

جانتے ہوئے بھی جھوٹ:

کس کو پتہ نہیں کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ سے ہمیشہ بچنا چاہیے؟...... آج
سو میں سے شاید ہی دو چار ایسے بندے ہوں گے جو سچ بولتے ہوں گے...... الا ماشا
اللہ...... وگرنہ اب تو عادتاً جھوٹ بولتے ہیں۔اور بعض اوقات تو جھوٹ کو جھوٹ ہی
نہیں سمجھتے یعنی ان کو جھوٹ بولنے کی اتنی تو عادت پڑ چکی ہے نا۔شیطان نے آج کے
زمانے میں گمراہ کرنے کے لیے اس کا ایک خوبصورت نام رکھ دیا ہے۔جھوٹ کا نام
اس نے بہانہ رکھ دیا ہے۔کیوں کہ جھوٹ کے لفظ سے تو بندہ ذرا محسوس کرتا ہے کہ میں
جرم کر رہا ہوں مگر بہانے کے نام سے یہ احساس بھی نہیں ہوتا۔بیوی کہتی ہے کہ بس
میں نے بہانہ کر دیا اور بچہ کہتا ہے کہ میں نے بس ابو کے سامنے بہانہ کر دیا۔ماتحت کہتا
ہے کہ میں نے افسر کے سامنے بہانہ کر دیا۔بھئی! بہانہ کیا ہوتا ہے؟ حقیقت میں تو
جھوٹ ہوتا ہے۔چنانچہ آج جھوٹ سے نفرت ختم ہوتی جا رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ
آج بندہ کسی پر ٹرسٹ (اعتماد) بھی نہیں کر سکتا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے؟ اس
طرح آپس میں ہر چیز مکس اپ ہوئی پڑی ہے۔معاشرہ دیکھو تو مسلمانوں کا ہے مگر
عمل دیکھو تو یہ موٹی موٹی باتیں بھی کہیں نظر نہیں آتیں...... الا ماشاء اللہ...... کس کو پتہ
نہیں کہ دوسروں کی خیر خواہی کرنی چاہیے؟...... مگر یہ تو ہر کوئی کہے گا کہ لوگ میرے
ساتھ خیر خواہی کریں، خود کتنی خیر خواہی کرتے ہیں؟...... اس کی طرف دھیان ہی نہیں
ہوتا۔تو آج ہماری سوچ بالکل مختلف ہو چکی ہے۔آج ہم اپنے علم پر عمل نہیں کر رہے۔
ایک وقت تھا جب مسلمانوں کی سوچ کچھ اور ہوا کرتی تھی، جب ہم صحیح معنوں میں

مسلمان تھے اس وقت کی بات آپ کو سنا دیتے ہیں۔ کہ ہمارے اندر کتنی خیر خواہی اور اچھائی تھی۔

ایک سبق آموز واقعہ:

ایک نوجوان کسب حلال کے لیے کسی دوسرے شہر گیا، ایک دن چھٹی تھی۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ آج میں شکار کرتا ہوں لہٰذا وہ پرندوں کا شکار کرنے کے لیے نکلا۔ اللہ کی شان کہ جب اس نے ایک پرندے کی طرف تیر پھینکا تو نشانہ خطا ہوا اور وہ تیر ایک کھیلتے ہوئے عیسائی لڑکے کو جا کر لگا۔ جیسے ہی اسے تیر لگا اس کی وہیں ڈیتھ ہوگئی۔

وہ نوجوان بچے کو اٹھانے کے لیے بھاگا۔ اتنے میں بچے کے والدین بھی آ گئے۔ اس نے بتایا کہ میں نے ارادتاً تو ایسا نہیں کیا، میں نے تو اپنی طرف سے پرندے کو تیر مارا تھا، مگر نشانہ خطا ہو گیا۔ آگے یہ کھیل رہا تھا اور تیر اسے لگ گیا۔ اس بچے کے رشتہ داروں نے اس کے والدین سے یہ کہا ہمیں تو نہیں پتہ کہ اس نے ارادتاً تیر مارا ہے یا غلطی سے لگا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بچے کے والدین کو مشورہ دیا کہ اس پر مقدمہ کر دیا۔ قاضی مسلمان ہے لہٰذا ہمیں توقع ہے کہ جو حقیقت ہے وہ کھل جائے گی۔ ہمیں انصاف ملے گا، چنانچہ اس نوجوان پر مقدمہ کر دیا گیا۔

جب نوجوان کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا تو قاضی نے پوچھا: کیا ایسا واقعہ ہوا ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں ہوا ہے۔ قاضی نے کہا: پھر دو میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لو۔ یا تو اس کے ورثاء کو راضی کر لو اور اگر راضی نہیں ہوتے تو پھر...... ﴿اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (جان کے بدلے جان)...... کے مصداق تمہیں پھانسی دی جائے گی۔ چنانچہ اس نوجوان نے اس بچے کے والدین کو راضی کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی صورت راضی ہو ہی نہیں رہے تھے۔ لہٰذا قاضی نے فیصلہ دے دیا کہ اس کو جیل

بھیج دیا جائے اور اگلے جمعہ کو جب نماز جمعہ پڑھ کر سزائیں دی جائیں گی تو اس کی سزا کا فیصلہ بھی سنا دیا جائے گا۔ چنانچہ اس نوجوان کو جیل بھیج دیا گیا۔

جیل کا سپرنٹنڈنٹ عیسائی تھا، اس نوجوان نے اس سے رابطہ کیا اور کہنے لگا: میں مسلمان ہوں۔ مجھ سے یہ معاملہ ہوا ہے اور میرے پیچھے میرا خاندان بھی ہے۔ بچے بھی ہیں اور ان کو میرے اس معاملے کا پتہ نہیں، اگر آپ مجھے اپنے ذمہ داری پہ Release (رہا) کر دیں تو جمعہ سے پہلے میں واپس آ جاؤں گا...... عیسائیوں کے دلوں میں اس زمانے میں مسلمانوں کے ایفائے عہد کی اتنی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ عیسائی کہنے لگا: ٹھیک ہے تم چلے جاؤ اور جمعہ سے پہلے آ جانا۔ اس نے قتل کے مجرم کو جیل سے گھر بھیج دیا۔

جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد جب قاضی نے پوچھا: فلاں بندہ کہاں ہے؟ جیل سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ میں نے اسے اپنی ذمہ داری پہ بھیجا تھا مگر ابھی تک وہ آیا نہیں۔ قاضی نے کہا: ٹھیک ہے، باقی مقدمات نمٹنے تک ہم انتظار کریں گے اور اگر اس وقت تک بھی وہ نہ آیا تو اس نوجوان کے بدلے میں ہم آپ کو پھانسی دی گے کیونکہ آ نے اس کو چھوڑا تھا۔

اب عیسائی اور زیادہ پریشان ہوئے کہ بندہ بھی ہمارا مرا، اب افسر بھی ہمارا پھانسی چڑھے گا۔ اس دوران قاضی دوسروں کے مقدمے سمیٹنے میں لگ گیا۔ جب آخری بندہ نمٹ گیا تو قاضی نے جیل سپرٹینڈنٹ کو بلایا اور کہا کہ اب ہم یہ حد آپ پر قائم کریں گے۔ یہ بات سننے کے باوجود جیل سپرنٹنڈنٹ کے چہرے پر پریشانی کے آثار بالکل نہیں تھے۔ چنانچہ وہ آرام سے قاضی کے قریب آ گیا، لوگ حیران تھے کہ آج یہ کیا ہو رہا ہے۔

اتنے میں کسی نے کہا: جی آپ تھوڑی دیر کے لئے انتظار کر لیں کیونکہ دور سے کوئی

آدمی آتا نظر آرہا ہے۔ قاضی نے کہا ٹھیک ہے، چند منٹ انتظار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ چند منٹ کے اندر وہی نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا، اس نے آتے ہی سب سے پہلے اس جیل سپرنٹنڈنٹ سے معافی مانگی اور کہا کہ میرے راستے میں ایک دریا تھا، مجھے تیرنا نہیں آتا تھا اور مجھے کشتی کے انتظار میں دیر ہوگئی۔ جس کی وجہ سے میں اپنے وعدے پر پورا نہیں اتر سکا، ورنہ میں وقت سے پہلے پہنچ جاتا۔ بہر حال اب میں پہنچ چکا ہوں مجھے قاضی صاحب کے سامنے پیش کر دیں۔ جب عیسائیوں نے اس نوجوان کی ایفائے عہد کی یہ بات سنی تو بچے کے ورثا نے قاضی سے کہا: قاضی صاحب! اس نوجوان نے اگر عہد پورا کرنے کی یہ مثال پیش کر دی ہے تو ہم آپ کی موجوگی میں دو باتیں کرتے ہیں۔

......ایک تو بچے کے قتل کا مقدمہ واپس لیتے ہیں

......دوسرا اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہیں

ایک وہ وقت تھا کہ کفر ہمارے عملوں کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حقیقی معنوں میں مسلمان ہیں۔

علم پر عمل نہ کرنے کی وجہ:

آج ہماری علت یہ ہے کہ ہم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے باتوں کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے خود بھی تنگ ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی مصیبت بن جاتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ ہم اللہ کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم چیزوں کو سمجھ تو رہے ہوتے ہیں مگر اپنی نفسانیت، خودسری اور تکبر کی وجہ سے ہم اس پر عمل نہیں کر رہے ہوتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں لیکن اس پر خوش بھی ہو رہے ہوتے ہیں۔ عورتیں آپس میں بات کرتی ہیں کہ میں نے پھر ایسی بات کہی کہ بس وہ جلتی رہی ہوگی۔ یعنی دوسری کا دل جلانے کے لیے بات کی۔

یہ کتنی عجیب بات ہے! بجائے اس کے کہ ہم دوسرے بندے کو راحت پہنچائیں ہم اس کو دکھ پہنچا رہے ہوتے ہیں۔

اگر گندگی فائدہ پہنچا سکتی ہے تو......

بچپن کے زمانے میں ہم ایک مرتبہ ایک دیہات میں گئے، اس عاجز کی عمر اس وقت سات آٹھ سال تھی، ہمارے ایک کلاس فیلو نے دعوت دی کہ آئیں آپ کو دیہات دکھاتے ہیں...... یہ وہ زمانہ تھا جب ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ گندم کسی پودے پر لگتی ہے یا درخت پر...... چنانچہ ہم نے بھی اس کی دعوت خوشی سے قبول کر لی کہ جا کر دیہات دیکھیں گے۔

جب ہم اس کے ساتھ گئے تو اس نے ہمیں کھیت دکھائے۔ ہم نے کھیت میں دیکھا کہ ادھر بھی نجاست کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور ادھر بھی گوبر کا ڈھیر لگا ہوا ہے، ہم نے کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بڑی پریشانی ہوئی کہ یہ گوبر ہے اور انہوں نے اس کے ڈھیر لگا کے رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ گوبر کے ڈھیر کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ اس نے کہا: کسان سے پوچھو؟ جب کسان سے پوچھا تو اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ تمہاری نظر میں تو یہ گوبر ہے، نجاست ہے اور گندگی ہے، تم شہری بچے ہو اس لیے تمہیں پتہ نہیں، تمہیں یہ گوبر اور نجاست نظر آ رہی ہے مگر ہماری نظر میں یہ فرٹیلائزر (کھاد) ہے، جب ہم اس کو اپنے کھیت میں ڈالتے ہیں تو اس سے کھیت کو فائدہ پہنچتا ہے اور فصل اچھی پیدا ہوتی ہے...... وہ بچپن کا زمانہ تھا اس لیے صحیح طور پر بات تو سمجھ نہ آئی مگر اب میں کبھی کبھی سوچتا ہوں......

''اے انسان! جسے ہم گندگی کہتے ہیں اور اسے بدبودار سمجھتے ہیں، اس گندگی کو اگر کھیت میں ڈالا گیا تو اس گندگی نے کھیت کو فائدہ پہنچا دیا۔ ایک مسلمان ہو کر اگر تُو اپنے ساتھ والے کو فائدہ نہیں پہنچاتا تو تُو گندگی اور نجاست سے بھی گیا گزرا ہے،،

اگر اپنی حقیت معلوم کرنا چاہیں تو......

قیامت کے دن سب سے پہلے یہی سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟ اب اس کے لیے عالم کا ہونا ضروری نہیں ہے کہ علما ہی سے پوچھیں گے۔ بلکہ ہر بندے سے پوچھیں گے اور صرف مردوں ہی سے نہیں پوچھیں گے بلکہ عورتوں سے بھی پوچھیں گے۔ تو ہم اپنے آپ سے آج ہی یہ سوال کرنا شروع کردیں کہ ایک وقت آئے گا، جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال پوچھیں گے۔ کیا اس کسوٹی پر ہم پورے اتر پائیں گے۔ اگر آج سے بھی اپنا محاسبہ کرنا شروع کردیں تو زندگی آسان ہوجائے گی، آپ کا دل آپ کو ٹھیک ٹھیک بتادے گا۔ اگر آپ اپنی حقیقت معلوم کرنا چاہیں تو اپنے دل سے گواہی لیں، کیوں کہ دل وہ گواہ ہے جو ہمیشہ سچی بات بتاتا ہے اور کبھی رشوت قبول نہیں کرتا۔ صاف تصویر دکھا دیتا ہے کہ میاں! تم اتنے پانی میں ہو، خواہ ہم لوگوں کے سامنے جو مرضی چہرے سجائے پھریں۔

﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴾

(القیٰمۃ:۱۴،۱۵)

انسان کو اپنے بارے میں پتہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے سامنے بے شک عذر پیش کرتا پھرے۔ تو آج انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ہماری تنزلی اور گراوٹ کا سب سے پہلا سبب ہے کہ ہم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔ چاہے کوئی دین کا پڑھا لکھا ہو، چاہے دنیا کا۔ تو اب یہ بات سمجھ لیں کہ کامیابی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے علم پر عمل کرنا ہے۔

(۲) بڑوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا

ہماری دوسری غلطی یہ ہے کہ ہم اپنے بڑوں کے تجربات سے فائدہ نہیں

اٹھاتے۔ہم اپنے بڑوں کی نصیحتوں پر عمل نہیں کرتے۔

نصیحتوں کی حقیقت:

یاد رکھیں کہ ماں باپ کی یا پیر استاد کی نصیحتیں بنیادی طور پر ان کی زندگی کے تجربات ہوتے ہیں۔انگریزی میں کہتے ہیں

There is no shortcut to experience.

(تجربے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں)

تو بجائے اس کے کہ ہم سب کچھ خود بھگتیں اور پھر آخر میں سمجھ آئے کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ہم اپنے بڑوں کی نصیحتوں پر عمل کر لیا کریں۔

تجربہ کار(Experienced) بندے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟...... اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بندہ جو اپنی زندگی میں بہت غلطیاں اور کوتاہیاں کر چکا ہو اور اسے پتہ ہو کہ اب میں نے یہ کوتاہیاں نہیں کرنی۔اس لیے جب فیکٹری میں کوئی بندہ رکھنا ہو تو کہتے ہیں: کوئی تجربہ کار بندہ لے آؤ! کیوں؟ اس لیے کہ وہ بہت کوتاہیاں کر چکا ہوگا اور اب اسے پتا ہوگا کہ میں نے کونسی کوتاہیاں نہیں کرنی۔

ایک آدمی جب کوئی کام سیکھتا ہے تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک پہلو یہ ہے کہ:

What to do?......(کیا کرنا ہے؟)

کام کو سیکھنا کہ میں نے کام میں کیا کرنا ہے؟ یہ کام سیکھنے کا ایک پہلو ہے۔اور ایک اور پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ:

What not to do?.....(کیا نہیں کرنا؟)

بندہ تھیوری کے ذریعے سے یہ تو جلدی معلوم کر لیتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔لیکن ......کیا نہیں کرنا؟ یہ دھکے کھا کے حاصل ہوتا ہے اور تجربہ کار بندے کو پتہ ہوتا ہے کہ

مجھے یہ نہیں کرنا، کیوں کہ اس میں نقصان ہے اور فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے بڑے ہمیں جو نصیحت کرتے ہیں وہ ساٹھ ستر سال کی عمر کا نچوڑ بتا رہے ہوتے ہیں کہ بچو! یہ نہ کرو اس میں تمہارا نقصان ہے۔

نوجوانوں کی رعونت:

آج کے نوجوانوں کی تو حالت ہی یہ بن چکی ہے کہ وہ بات ہی نہیں سنتے۔ نبی ﷺ نے قرب قیامت کی ایک نشانی یہ بتائی کہ نوجوان اپنے دوست کو زیادہ محبوب رکھیں اور اپنے ماں باپ سے دور ہو جائیں۔ اور کئی جگہوں پر تو ایسا ہے کہ نوجوان اپنے باپ سے ایسے نفرت کرتے ہیں جیسے پاپ سے نفرت کی جاتی ہے۔ وہ جو کسی زمانے میں باپ سے محبت کا تعلق تھا اور اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا آج وہ تصور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دو لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے، ایک نے کہا: بھئی! تمہارے ابو تین چار مرتبہ ہسپتال جا چکے ہیں خیر تو ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، انہیں دو تین مرتبہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے لیکن وہ ریکور (صحت یاب) ہو جاتے ہیں، آج پھر ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اور آج پھر ہاسپٹل گئے ہیں۔

I hope he will be able to make it this time .

(میرا خیال ہے کہ اب وہ ٹرک جائے گا)

اپنے باپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، یہی بنیاد ہے جس کی وجہ سے ہمارے نوجوان اپنے ماں باپ کی سونے کے پانی سے لکھی جانے کے قابل نصیحتیں، پیٹھ پیچھے ڈال دیتے ہیں۔ صرف یہ بات نہیں ہے کہ ممبر و محراب سے سن کر اس پر عمل نہیں کرتے نہیں نہیں نہیں!! گھر میں سن کر کہاں عمل کرتے ہیں؟ خاوند بیوی کو منع کرتا ہے کہ تمہارے لئے یہ ٹھیک نہیں، یہ ٹھیک نہیں...... کیا وہ سنتی ہے؟ بڑا بھائی چھوٹے بھائی کو منع کرتا ہے کہ تمہارے لیے یہ ٹھیک نہیں، یہ ٹھیک نہیں، کیا وہ مانتا ہے؟ تو یہ کیسی چیز

ہے؟ جو بحیثیت قوم ہمارے اندر Develop (پروان) ہو چکی ہے، اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہماری پرسنیلیٹی (شخصیت) ایسی بن جائے کہ ہم اپنے بڑوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانے والے بن جائیں۔ جب بڑوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانے والی صفت ہمارے اندر آئے گی تو پھر جمعہ کے دن ہم سب سے پہلے مسجد میں پہنچے ہوئے ہونگے کہ ہم خیر کی باتیں سنیں اور ان پر عمل کریں۔

یہ خیر کی باتیں سننے کی صفت ہی ہمارے اندر سے ختم ہوتی جا رہی ہے، ہم سننا ہی نہیں چاہتے، آج تو ہر بندہ سنانا چاہتا ہے۔ ہم نے کئی بار دیکھا ہے کہ دو بندے آپس میں بات چیت کر رہے ہوتے ہیں تو وہ بھی بول رہا ہوتا ہے اور یہ بھی بول رہا ہوتا ہے۔ نہ وہ سن رہا ہوتا ہے اور نہ یہ سن رہا ہوتا ہے۔ ہمارے اندر تو اتنا صبر بھی نہیں کہ ہم کسی کی بات کو توجہ سے سن ہی لیں۔ آج تو نوجوان آپس میں باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور نئے نئے پلان بنا کر ان پر عمل کر رہے ہوتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ:

Young leading the young is like a blind leading the blind.

They can both fall into the ditch.

(کسی نوجوان کا دوسرے نوجوان کو رہنمائی دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی اندھے کا دوسرے اندھے کو رہنمائی دینا، وہ دونوں گڑھے میں گر سکتے ہیں)

آج کے نوجوان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ بن چکی ہے کہ اگر کسی پر نظر پڑ جائے کہ دیکھا کہ ذرا اچھا ٹھپہ ہے تو کہتا ہے: بس، ابو! میں نے ادھر ہی شادی کرنی ہے۔ اس کے ابو بتاتے ہیں کہ اس کی اتنی تعلیم ہی نہیں اور تیرے ساتھ اس کا جوڑ ہی نہیں۔ مگر وہ سنتا ہی نہیں، وہ یہی کہتا ہے کہ بس کرنی ہے۔ جب ایسی جگہ پر شادی کر لیتے ہیں تو پھر ساری زندگی روتے بھی ہیں اور بھگتتے بھی ہیں۔ چنانچہ ہمیں اچھے مسلمان ہونے کی حیثیت سے چاہیے کہ ہم بڑوں کی باتیں توجہ سے سنا کریں اور پھر

ان پر عمل کیا کریں۔ بعض اوقات ان نصیحتوں کی حکمت بعد میں سمجھ آتی ہے۔ اس لیے اس وقت سمجھ میں نہیں آ رہی ہوتی کہ اس وقت ہم شارٹ سائٹڈ ہوتے ہیں۔ ہمارا ویژن ہی اتنا نہیں ہوتا کہ ہم اتنا دور دیکھ سکیں لیکن ہمارے ماں باپ کی نظر دور تک دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اگر بعد میں سمجھ میں آیا تو وہ معاملہ ہوگا کہ ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت''۔

نوجوان اول تو نصیحت کی باتیں سنتے ہی نہیں اور اگر سنتے ہیں تو ان پر عمل نہیں کرتے حالانکہ ہمیں تو یوں کہا گیا ہے:

كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنْ

(حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے)

بس تو یہ حکمت کی بات جہاں سے بھی ملے حاصل کر لینی چاہیے، پہلے وقتوں میں ماں باپ اپنے بچوں کو نصیحتیں کیا کرتے تھے اور پھر بچے ان سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ آج نصیحت کرنے کا سلسلہ نظر ہی نہیں آتا۔ کتنے مرد ہیں جو آج گھروں میں نصیحت کی باتیں سمجھاتے ہیں؟ یاد رکھیں کہ جس گھر کے مرد اپنے اہل خانہ کو نیکی اور نصیحت کی بات نہیں سمجھاتے اس گھر کے مُردوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں خیر کی باتیں کیا کریں۔ تو یہ بات یاد رکھیں کہ کامیابی کا دوسرا اصول بڑوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے۔

(۳) گناہوں پر استغفار

ہماری تیسری بڑی کوتاہی اور غلطی یہ ہے کہ ہم اپنے گناہوں پر استغفار نہیں کرتے۔ گناہ کر لیتے ہیں مگر اس پر جیسے استغفار کرنا چاہیے ہم نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بہت ساری رحمتیں رک جاتی ہیں۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ

طُوْبٰی لِمَنْ وَّجَدَ فِیْ صَحِیْفَتِہٖ اِسْتِغْفَارَ کَثِیْرًا

''مبارک ہو اس شخص کو جو (قیامت کے دن) اپنے نامہ اعمال میں سے سے زیادہ استغفار کا عمل دیکھے گا''

استغفار سب مسائل کا حل:

ایک مرتبہ حضرت حسن بصری بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی ان کے پاس آیا، اس نے کہا: حضرت! میں بہت گناہگار ہوں، کوئی عمل بتا دیں۔ فرمایا: استغفار کرو! پھر ایک اور بندہ آیا اس نے کہا: حضرت بارش نہیں ہو رہی، کوئی وظیفہ بتا دیں۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بارش عطا فرما دیں۔ فرمایا: استغفار کرو! پھر ایک اور آدمی آیا، کہا: حضرت! بہت غریب ہوں، کوئی عمل بتا دیں جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے حالات اچھے کر دے اور مال عطا فرما دے۔ فرمایا: استغفار کرو! ایک آدمی اور آیا کہ جی میری اولاد نرینہ نہیں، آپ کوئی ایسا عمل بتا دیں جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ یہ نعمت عطا فر دیں۔ فرمایا: استغفار کرو!

ایک آدمی پاس بیٹھا تھا، وہ سن کر بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا: حضرت! یہ اچھا فارمولا آپ کے ہاتھ میں آیا ہے کہ ہر ایک کو فرما رہے ہیں کہ استغفار کرو، استغفار کرو۔ حضرت نے جواب دیا کہ میں نے ان کو اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی بلکہ اللہ کے قرآن کی روشنی میں ان کو جواب دیے ہیں۔ قرآن مجید کی آیت ہے:

﴿ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴾ (النوح:۱۰)

اللہ کے سامنے استغفار کرو، وہ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ پہلے آدمی نے گناہوں سے معافی کا عمل پوچھا تھا اور میں نے اسے استغفار بتایا تھا:

آگے فرمایا:

﴿ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴾ (النوح:۱۱)

''اللہ کے سامنے استغفار کرو، وہ تمہارے اوپر بارش برسائے گا''

دوسرے نے بارش کا مسئلہ پوچھا، لہٰذا میں نے اسے بھی یہی کہا کہ استغفار کرو۔

اللہ تعالیٰ آگے فرماتے ہیں:

﴿ وَ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ ﴾ (النوح:۱۲)

''اور مال کے ذریعے وہ (اللہ تعالیٰ) تمہاری مدد کرے گا''

غریب کے وظیفہ پوچھنے پر میں نے اسی لیے استغفار کرنے کے لیے کہا تھا۔

وَ بَنِيْنَ ''اور بیٹوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا''

اسی لیے اولاد نرینہ کے طالب کو میں نے کہا تھا کہ استغفار کیا کرو۔

﴿ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ ﴾ (النوح:۱۲)

''اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ باغوں کے پھل عطا فرمائے گا''

میں نے اسی لئے باغ والے کو یہ عمل بتایا کہ استغفار کرو۔

﴿ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَارًا ﴾ (النوح: ۱۳)

''اور تمہارے لیے (زمین سے) چشمے جاری کردے گا۔''

اسی لیے میں نے زمین میں چشمے کے طالب کو استغفار کرنے کے لیے کہا۔

اب دیکھیں کہ ایک استغفار کے عمل پر ہمیں کتنے فائدے مل سکتے ہیں۔

عاملوں کی گاڑی کیسے چلتی ہے؟

آج جسے دیکھو وہ عاملوں کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے، عملیات والوں کے پاس جا جا کر اپنا ایمان خراب کر بیٹھے ہیں۔ کیا ضرورت ہے ان کے پاس جانے کی؟ استغفار کیجیے اور مرادیں پائیے۔ یاد رکھیں کہ عامل لوگ بندوں کو بہت ہی ڈراتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ لگتا ہے کسی نے کچھ کیا ہوا ہے، اگلی سٹوری وہ خود بنا لیتے ہیں۔ بیوی کہتی ہے: دیکھا! آپ کی بہن نے کچھ کیا ہوا ہے۔ خاوند کہتا ہے: مجھے لگتا ہے کہ فلاں نے کچھ کیا ہوا ہے۔ یوں قریب کی رشتہ داریاں ایک دوسرے کے ساتھ چھپی دشمنیوں میں بدل جاتی ہیں۔ ان عاملوں کے پاس بالکل نہیں جانا چاہیے، یہ پروفیشنل (پیشہ ور) قسم کے لوگ اس طرح دوسروں کی پریشانیاں دور کر سکتے تو وہ اپنی پریشانیاں دور نہ کر لیتے۔ وہ تو اس انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ کوئی مرغا آئے اور پھنسے، کچھ دے اور ہماری گاڑی چلے۔ بھئی! جن کی گاڑی آپ کے جانے سے چلتی ہے، وہ آپ کی گاڑی کیا چلائیں گے؟ لوگ خواہ مخواہ ان کے پاس جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو بندوں کو چھوٹا خدا بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں: حضرت! لگتا ہے کسی نے ہمارا کاروبار باندھ دیا ہے۔ اب ایک بندہ مسلمان ہے اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں کہ کسی نے کاروبار کو باندھ دیا ہے۔ اس کا یہ کہنا کتنا عجیب ہے! کیونکہ رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ (ہود: ۶)

''اور زمین میں جو ذی روح جاندار ہے اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے''

رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ کسی نے رزق باندھ دیا ہے۔ یوں گویا لوگوں کو چھوٹا خدا بنا لیتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی نے میری بیٹی کا رشتہ باندھا ہوا ہے۔ یاد رکھیں کہ کوئی کچھ نہیں باندھ سکتا۔ سب کام اللہ رب العزت کے اذن سے ہوتے ہیں۔ ہم اللہ رب العزت کو خوش کر لیں تو اس کی طرف سے ہمارے لیے خیر کے فیصلے ہو جائیں گے۔ اور ان تمام پریشانیوں کا حل استغفار ہے۔

مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کا نسخہ:

اسی استغفار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کو مصیبتوں اور عذابوں سے بچاتے

ہیں۔ سنیے قرآن عظیم الشان ...... اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اے محبوب ﷺ!

﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ (الانفال:۳۳)

''اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا جب تک آپ ان میں موجود رہیں گے''

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾

اور اللہ ان کو اس وقت تک بھی عذاب نہیں دے گا جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے۔ بیٹی کا رشتہ نہ ہونا کتنا بڑا عذاب ہے! نوجوان کو رزق نہ ملنا یا اس کا کاروبار نہ چلنا کتنا بڑا عذاب ہے! لیکن یاد رکھیں کہ جب تک ہم استغفار کرتے رہیں گے اس وقت تک اس عذاب سے بچے رہیں گے۔ انہی کے غم میں ماں کو ایسی بیماریاں لگ جاتیں ہیں کہ وہ پریشان ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ابھی استغفار کے فوائد ہی نہیں سمجھ پائے۔

ہر وقت استغفار کریں:

آپ استغفار کی کثرت کریں۔ ایک تو یہ ہے کہ صبح و شام یہ پڑھا جائے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ

یہ تو پورا استغفار ہے۔ اگر مرد حضرات چلتے پھرتے بھی ...... استغفر اللہ، استغفر اللہ ...... پڑھتے رہیں اور عورتیں گھر میں کھانا تیار کرتے وقت اور صفائی وغیرہ کرتے ہوئے بھی استغفر اللہ کرتی رہیں گی تو اس کو بھی استغفار میں شامل کر لیا جائے گا۔ لوگ کہتے ہیں جی کوئی عمل بتایئے؟ بھئی! اس سے بڑا عمل کیا ہے؟ اس پر تو اللہ کا قرآن گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب نعمتیں استغفار کے سبب ملتی ہیں۔

بغیر غلطی کے بھی استغفار کریں:

ہمیں چاہیے تو یہ تھا کہ ہم بغیر غلطی کے بھی استغفار کرتے۔ اس لیے کہ بغیر غلطی

کے استغفار کرنا رحمت الٰہی کو کھینچنے کا سبب بنتا ہے۔آپ کا بیٹا اگر کسی وقت آپ کے پاس آ کر معافی مانگ رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ امی ! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہوتو مجھے معاف کردیں۔حالانکہ اگر اس نے غلطی نہ کی ہوتو کیا ایسی صورت میں اس پر پیار نہیں آتا ؟ ۔ماں کہتی ہے کہ یہ میرا کتنا پیارا بیٹا ہے کہ بغیر غلطی کے مجھ سے معافی مانگ رہا ہے! استغفار کا معاملہ بھی ایسے ہی ہے۔جب بندہ بغیر غلطی کے اللہ رب العزت کے سامنے استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے اس بندے پر پیار آتا ہے۔چنانچہ یہ اصول بنالیں زندگی کا کہ اللہ کے حضور ہر وقت نادم وشرمندہ رہنا ہے اور استغفار کرتے رہنا ہے۔

(۴) نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا

ہماری چوتھی کوتاہی یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جو نعمتیں ہمیں عطا کی ہیں ان کا صحیح معنوں میں شکر ادا نہیں کرتے۔ہمیں نعمتوں کا شکر ادا کرنا اس وقت یاد آتا ہے۔جب وہ نعمت چلی جاتی ہے۔کسی نے کہا تھا کہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے نعمتوں کے چھن جانے کا انتظار نہ کرنا۔جب نعمت چھن جائے اس وقت اس کا شکر ادا کرنے کا کیا فائدہ؟ نعمتوں کی موجودگی میں ہی نعمتوں کا شکر ادا کیجیے۔

صحت نعمت ہے۔

فراغت کا وقت نعمت ہے۔

مال نعمت ہے۔

جوانی نعمت ہے۔

ماں باپ نعمت ہیں۔

پیر استاد نعمت ہیں۔

ان نعمتوں کی ہم کتنی قدر کرتے ہیں اور کتنا اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں؟ بلکہ ہم نے تو یہ دیکھا کہ جس بندے کو اللہ نے اتنا مال دیا ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے ساتھ ساتھ چالیس اور خاندانوں کو بھی سپورٹ کر سکتا ہے، اس بندے سے کبھی پوچھیں کہ سنائیں کام کاج کیسا ہے؟ تو وہ بھی کہتا ہے، جی بس گزارا ہے۔ اب اگر اللہ نے اتنا دیا ہوا ہے اور پھر اس بات کے جواب میں ہم یوں کہیں کہ بس گزارا ہے تو اس پر اللہ کو غصہ آئے گا یا نہیں؟ اسی طرح خاوند اپنی بیوی پر بے تحاشا دولت خرچ کرتا ہو اور اس کی بیوی اپنی ماں کو یہ رپورٹ دے کہ میں بس گزارا ہی کر رہی ہوں، تو خاوند کو کتنا غصہ آئے گا؟ یہی حال ہمارا ہے، کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں : جی بس گزارا ہے۔ پتہ نہیں ہماری زبان کیوں جھوٹی ہو جاتی ہے۔ ہمیں تو یہ چاہیے تھا کہ ہم یوں کہتے : او جی! اللہ نے تو مجھے اتنا دیا کہ میں تو ساری زندگی سجدے میں سر ڈال کر اللہ کا شکر ادا کرتا رہوں تو میں اپنے مولا کا پھر بھی شکر ادا نہیں کر سکتا۔ ہم کیوں نہیں کہتے کہ جی اللہ تعالیٰ نے تو ہم بے قدروں کو ہماری اوقات سے بھی بڑھ کر اپنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔

تین آدمیوں کی آزمائش کا واقعہ:

ترجمان السنہ میں حضرت مولانا بدر عالم ؒ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک آدمی تھا، وہ برص کا مریض تھا، جلد پر جو سفید دانے بن جاتے وہ برص کے داغ ہوتے ......اس کے چہرے پر برص کے ایسے نشان تھے کہ اس کا چہرہ دیکھنے کو لوگوں کا دل نہیں کرتا تھا۔ اتنی کراہت ہوتی تھی۔ اس کا کام کاج بھی نہیں چلتا تھا۔

ایک آدمی اس کے پاس آیا اور کہنے لگا: سناؤ بھئی! کیا حال ہے؟ کیسا وقت گزر رہا ہے؟ اس نے کہا: کیا بتاؤں! بیماری بھی ہے، میں لوگوں میں بیٹھنے کے قابل بھی

نہیں، میرا کاروبار بھی نہیں، اور بہت تنگی کے دن گزر رہے ہیں۔ اس آدمی نے اس برص والے کو دعا دی کہ اللہ تیری بیماری کو بھی ٹھیک کر دے اور تجھے رزق بھی فراغ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کی بیماری بھی ٹھیک کر دی اور اس کو ایک اونٹنی عطا کی، اس اونٹنی سے اتنا کام بڑھا کہ وہ اونٹوں کے بڑے ریوڑ کا مالک بن گیا اور بڑے ٹھاٹھ کی زندگی گزارنے لگا۔

وہی آدمی وہاں ایک اور آدمی کے پاس گیا، اس کے سر پر بال نہیں تھے، گنجا تھا۔ اس کا بھی کاروبار نہیں چلتا تھا۔ اس نے اسے پوچھا: سناؤ بھئی! کیا حال ہے؟ کہنے لگا: جی کیا بتاؤں! بس جہاں جاتا ہوں لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں، میرا کاروبار بھی ٹھیک نہیں اور میں بڑی پریشانی میں وقت گزار رہا ہوں۔ اس نے اسے بھی دعا دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کی برکت سے اسے خوبصورت بال عطا کر دیے۔ جس سے اس کی پرسنلٹی بہترین بن گئی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک گائے دی۔ اس ایک گائے کی نسل اتنی بڑھی کہ وہ سینکڑوں گایوں کا مالک بن گیا، اس کی زندگی میں بھی خوشحالی آ گئی۔

پھر وہ تیسرے بندے کے پاس گیا وہ اندھا تھا۔ اس سے پوچھا: سناؤ بھئی! کیسے گزر رہی ہے؟ کہنے لگا: میں کیا بتاؤں! لوگوں سے مانگ کے روٹی کھاتا ہوں، در در کے دھکے کھاتا ہوں، لوگوں کے لیے تو فقط رات میں اندھیرا ہوتا ہے اور میرے لیے تو دن کی روشنی میں بھی اندھیرا ہوتا ہے۔ جس کو اماں کہتا ہوں میں نے اس کی شکل ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھی، ابو کی شکل بھی کبھی نہیں دیکھی۔ اور میرا کاروبار بھی کوئی نہیں۔ اس نے اسے بھی دعا دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کی بینائی بھی ٹھیک کر دی اور اس کو ایک بکری دی، اس بکری کی اتنی نسل بڑھی کہ وہ بکریوں کے بڑے ریوڑ کا مالک بن گیا۔

بنی اسرائیل کے یہ تینوں آدمی بڑے بڑے نواب بن گئے۔ جب پیسہ آتا ہے تو پھر انسان سہولت پسند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے محل بن گئے، خوبصورت بیویاں آ گئیں، نوکر چاکر آ گئے، لائف سٹینڈرڈ اونچا ہو گیا اور خوب ٹھاٹھ کی زندگی گزارنے لگے۔ پھر دوست بھی بہت بن گئے۔ کئی سالوں تک وہ اسی طرح اللہ کی نعمتوں کے مزے لیتے رہے اور پلتے رہے۔

ایک دن وہی بندہ پہلے آدمی کے پاس آیا اور آ کر اسے کہا: بھئی! بات یہ ہے کہ میں بہت محتاج ہوں، میں ضرورت مند ہوں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے، آپ اللہ کے لیے مجھے کچھ دے دیں۔ ایک وقت تھا آپ کے پاس بھی کچھ نہیں تھا: آج دیکھو! اللہ نے آپ کو کتنا کچھ دیا ہے! جب اس نے یہ سنا کہ ایک وقت تھا جب آپ کے پاس کچھ نہیں تھا، تو اس کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا: آ جاتے ہیں منہ اٹھا کے، بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ خبردار! میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دونگا، میں تو شروع سے ہی امیر تھا۔ کیا تم سے میں نے پیسے مانگے ہوئے ہیں؟ جب وہ ناراض ہونے لگا، تو اس نے کہا: بھئی! آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں، میں جا رہا ہوں۔ بس آپ جیسے تھے اللہ تعالیٰ آپ کو ویسا کر دے۔ اس کے بعد ایسی بیماری آئی کہ اونٹوں کا سارا ریوڑ ختم ہو گیا اور وہی برص کی بیماری لگ گئی۔

اس کے بعد وہ دوسرے آدمی کے پاس گیا۔ جو گنجا تھا اس سے کہا: جی میں محتاج ہوں، فقیر ہوں، آپ کو اللہ نے بہت دیا ہے، آپ اللہ کے نام پہ مجھے بھی کچھ دے دیں، میری مدد کریں، ایک وقت تھا کہ آپ کے پاس بھی کچھ نہیں تھا اور آج بہت کچھ ہے۔ جب اس نے یہ بات کی تو اس کو بھی غصہ آیا اور کہنے لگا: تجھے بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، میں نے درختوں سے جا کے پیسے توڑے ہیں؟ میں ایسا بزنس مین ہوں...... میں نے ایسی ڈیل کی ...... مجھے اتنا بچا...... میاں! میری یہ خون پسینے کی کمائی

ہے، تم کیسے یہ بات کہہ رہے ہو؟ جب وہ کچھ زیادہ ہی ناراض ہونے لگا تو اس نے کہا: بھئی! ناراض نہ ہو، اچھا میں جاتا ہوں، آپ جیسے تھے اللہ آپ کو ویسا کر دے۔ لو جی اس کی حالت بھی وہی ہوگئی، سب گائیاں بھی ختم ہوگئیں اور سر کے بال بھی غائب ہوگئے۔ جیسا تھا ویسا ہوگیا۔

پھر وہ تیسرے کے پاس گیا، اسے بھی جا کر یہی کہا کہ میں بڑا محتاج ہوں، ضرورت مند ہوں، آپ کے پاس آیا ہوں، مجھے کچھ دیں۔ ایک وقت تھا کہ آپ کے پاس بھی کچھ نہیں تھا اور آج اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہوا ہے۔ جیسے ہی اس آدمی نے یہ الفاظ کہے کہ ایک وقت تھا جب آپ کے پاس بھی کچھ نہیں تھا تو اس بندے کی آنکھوں میں سے آنسو آگئے۔ اس نے پوچھا: کیا ہوا؟ کہنے لگا: بھئی! تم نے بالکل سچ کہا، ایک وقت تھا، جب میں اندھا تھا، میں در در کے دھکے کھایا کرتا تھا۔ میں لوگوں سے مانگ کر ٹکڑے کھاتا تھا اور مجھے کوئی کچھ نہیں دیتا تھا۔ اللہ کا کوئی بندہ آیا اس نے دعا دی اور میرے اللہ نے مجھے بینائی بھی دے دی اور مجھے اتنا مال دے دیا۔ میاں! اگر آج تم اس اللہ کے نام پر کہتے ہو کہ کچھ دو، ان دو پہاڑوں کے درمیان جتنی ہزار بکریاں تمہیں نظر آرہی ہیں، یہ سب میرے مولا کی دین ہیں۔ تم ان میں سے جتنی بکریاں چاہو لے جاؤ۔ اس آدمی نے جواب میں کہا، تمہیں مبارک ہو، میں فرشتہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی نعمتیں دے کر تین بندوں کے پاس بھیجا تھا، ان میں سے دو اپنی اوقات کو بھول گئے اور تم نے اپنی اوقات کو یاد رکھا، اللہ تمہیں اپنی اور بھی زیادہ نعمتیں عطا کرے۔ اس کے بعد اللہ رب العزت نے اس بندے کو باقی زندگی میں اور بھی زیادہ نعمتوں سے نوازا۔

نعمتیں بے شمار ہیں:

ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اتنا شکر ادا نہیں کرتے جتنا کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں ہر لمحے

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللہ کی نعمتوں کی تفصیل تو بے حد وحساب ہے۔ تاہم یاد رکھیں کہ:

☆ ...... اللہ نے گھر دیا...... یہ بھی نعمت ہے۔

☆ ...... اولاد دی...... یہ بھی نعمت ہے۔

☆ ...... اچھی بیوی دی...... یہ بھی نعمت ہے۔

☆ ...... صحت دی...... یہ بھی نعمت ہے۔

☆ ...... عزت دی ...... یہ بھی نعمت ہے۔

☆ ...... اللہ نے کوتاہیوں پہ پردہ ڈال دیا...... یہ بھی اللہ کی نعمت ہے۔

☆ ...... اللہ نے ہمیں رسوائی سے بچالیا ...... یہ بھی اللہ کی نعمت ہے۔

ہم اللہ کی کس کس نعمت کا شکر ادا کر سکتے ہیں!!؟؟

ایک دوسرے کی قدر کریں:

حقیقت یہی ہے کہ ہم نعمت کی موجودگی میں شکر ادا نہیں کرتے۔ آج تو حالت یہ ہے کہ بیوی سے پوچھیں تو ایک ہی سانس میں خاوند کی کئی برائیاں گنوا دے گی۔ اور خاوند سے پوچھو تو ایک ہی سانس میں اپنی بیوی کی ناپسندیدگی کی کہانیاں سنائے گا۔ اچھا! اگر یہ خاوند مر جائے تو یہی بیوی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ اس سے اگر کوئی پوچھے کہ جی رو کیوں رہی ہیں؟ آپ تو کہتی تھی: اس نے مجھے بہت تنگ کیا ہوا ہے، مصیبت میں رکھا ہوا ہے، بڑے عذاب میں ہوں، اب تو تمہارا عذاب ختم ہو گیا ہے۔ وہی بیوی کہے گی: نہیں، آخر میرے بچوں کا باپ تھا۔ اس نے مجھے عزت دی ہوئی تھی۔ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی بات تو نہیں کر سکتا تھا اور مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ اب تو میں بے سایہ ہو گئی ہوں۔ اب اس کی قدر آنے لگ گئی کہ اس کے اندر کیا کیا خوبیاں تھی۔ اور اگر بیوی مر جائے تو وہی خاوند آنسو بہا رہا ہوتا ہے۔ اس

سے اگر پوچھا جائے کہ بھئی! تم تو خود کہتے تھے کہ میں نے یہ کیا عذاب خرید لیا! بہتر نہیں کہ اس سے جان چھوٹ گئی؟ وہی خاوند کہے گا: آخر وہ میرے بچوں کی ماں تھی، میں کاروبار پر چلا جاتا تھا اور مجھے بچوں کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس نے میری عزت رکھی ہوئی تھی اور میرا گھر سنبھالا ہوا تھا، اب بیوی کی خوبیاں یاد آنے لگیں۔ یہ خوبیاں ہمیں زندگی میں کیوں نہیں یاد آتیں؟ ہم زندگی میں دوسرے بندے کی قدر کیوں نہیں کرتے؟

انگریزوں کا ایک دستور:

انگریزوں میں ایک دستور ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے لیے پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے بنا کر لے جاتے ہیں اور منوں، ٹنوں کے حساب سے اس کی قبر پر پھول لاد دیتے ہیں۔ اس پر کسی نے ایک نظم لکھی، اس میں سے صرف ایک فقرہ اس وقت ہمارے موضوع سے ریلیٹیڈ ہے۔ وہ کہتا ہے:

Why do we wait till a person die?

''یعنی ہم کسی کو پھول پیش کرنے کے لیے اس کے مرنے کا انتظار کیوں کرتے ہیں۔''

کاش! ہم اس کی زندگی میں پھول پیش کرتے اس کو بھی خوشی ہوتی اور ہمیں بھی خوشی ہوتی۔

(۵) مرنے والوں سے عبرت حاصل کرنا

ہماری پانچویں کوتاہی یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے میتوں کو دفن کرتے ہیں مگر عبرت نہیں پکڑتے کہ ہمارے ساتھ بھی یہ کچھ ہونے والا ہے۔ ہم اپنے کندھوں پر کتنے جنازے لیکر گئے؟ کیا ہماری یہ حالت ہے کہ دل میں پکا یقین ہو کہ ہم بھی ایک

دن جائیں گے؟ یاد ہی نہیں ہوتا۔قبرستان کے باہر قدم رکھا اور پھر وہی دنیا۔

ماں کی موت سے بھی عبرت نہ ملی!!!

ہمارے ایک دوست کہنے لگے کہ میرے سامنے والے ہمسائے کی والدہ کی وفات ہوئی تو میں نے اپنے بچوں کو سمجھایا، بچو! دیکھو یہ کتنا بڑا حادثہ ہوا کہ تمہارے دوست کی والدہ فوت ہوگئی! اب چالیس دن تک گھر میں یہ کیبل اور ٹی وی وغیرہ نہیں چلے گا۔ میں نے بچوں کو اس پر راضی کرلیا اور وہ مطمئن ہوگئے۔ کہنے لگے کہ ابھی تیسرا دن نہیں ہوا تھا کہ اسی گھر سے کیبل اور ٹی وی کی آواز آنے لگی، پھر وہی تماشا شروع ہوگیا۔

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی:

جو نوجوان اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو دفن کر کے آئے اور پھر نصیحت نہ پکڑے تو پھر اس سے زیادہ بد بخت دنیا میں کون ہوسکتا ہے!!؟ ماں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آتے ہیں اور ان کی زندگی کی ترتیب نہیں بدلتی۔ نہیں سمجھتے کہ ہمیں بھی ایک دن وہاں جانا ہے۔ بس اپنی زندگیوں میں مست ہوتے ہیں۔ اللہ نے مال دے دیا اور اولاد دے دی، اور بس اللہ کی نعمتوں میں مست رہتے ہیں، اپنی شہوتوں کو پورا کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے لگے رہتے ہیں، مزے اڑاتے رہتے ہیں۔ بھئی! بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ کب تک مزے اڑاتے رہیں گے؟ ایسا نہ ہو کہ ''لمحوں نے خطائیں کی صدیوں نے سزا پائی'' والا معاملہ نہ بن جائے۔ آج یہ تھوڑے دنوں کے موج میلے ہیں۔ اور کل قیامت کے دن اللہ کے سامنے جوابدہ بھی ہونا پڑے گا۔

اگر ہم ان پانچ نصیحتوں کو اپنی زندگی میں لاگو کرلیں تو زندگی کی ترتیب سیدھی

ہوسکتی ہے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ہمیں اپنے اندر جو غلطیاں بھی نظر آتی ہیں وہ خود بخود اچھائیوں میں بدل جائیں گی۔ تو یہ باتیں اس لیے بتائیں کہ ان کو یاد کر لیجیے۔ اگر آپ گھر میں بڑے ہیں یا آپ کا کوئی دوست آپ سے کہتا ہے کہ بھئی کوئی نصیحت کر دیں تو یہ باتیں ان کو سمجھائیں تا کہ ان کو بھی ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔

اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کی کمی کوتاہی کو دور کر دے ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ آپ کا یہاں آنا قبول فرما کر اس کو دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ (آمین ثم آمین)

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ﴾

(النساء::۱۳۶)

دو رنگی چھوڑ دے
یک رنگ ہو جا

بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

دامت برکاتہم

اقتباس

ہم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہم اپنے آپ سے پوچھیں کہ ہمارا کون سا عضو مسلمان ہے؟ تھوڑی دیر کے لیے اسی پر بیٹھ کر غور کریں......کیا میری آنکھیں مسلمان بن گئیں؟......اس لیے کہ جو آنکھیں مسلمان ہوں گی وہ غیر محرم پر بری نیت سے نہیں ڈالیں گے......کیا میرے کان مسلمان بن گئے؟ کہ یہ خلاف سنت باتیں نہیں سنیں گے......کیا میری زبان مسلمان بن گئی؟ کہ اس سے کوئی بات خلاف شرع نہیں نکلے گی......کیا میرے ہاتھ مسلمان بن گئے؟ کہ یہ اب کسی مسلمان کی جان، مال اور عزت پر نہیں اٹھیں گے۔کیا میرے پاؤں مسلمان بن گئے؟ کہ یہ پھر کسی گناہ کے لیے چل کر نہیں جائیں گے،اگر ایسا نہیں تو ہمارے جسم کا کون سا عضو مسلمان ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؟

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (النساء::۱۳۶)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

لفظ ''اٰمِنُوْا'' اہلِ علم کی نظر میں:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (النساء::۱۳۶)

(اے ایمان والو! اے ماننے والو! اے وہ لوگو! جو اللہ رب العزت اور اس کے پیارے محبوب ﷺ کے حکموں کو ماننے کا اقرار کر چکے ہو)

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

(تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ)

قرآن پاک کی یہ آیت پڑھنے والوں کو حیران کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں خطاب بھی ایمان والوں سے ہے۔ فرمایا...... يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... کافروں سے خطاب نہیں، کہ یہ کہا ہو...... يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... منافقوں سے خطاب نہیں کہ یہ کہا ہو...... يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ نَافَقُوْا...... خطاب کن سے ہے؟...... ایمان والوں سے...... اور حکم کیا دے رہے ہیں؟...... اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (تم اللہ اور اس

کے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ)... ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم!!!......اٰمِنُوا کا کیا مطلب ہے؟ اس کے کئی مطلب لیے گئے ہیں۔

◉......بعض نے فرمایا: اٰمِنُوا کا مطلب ہے اِتَّقُوا" کہ تم اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو۔

◉......بعض نے فرمایا: "اے زبان سے اقرار کرنے والو! اپنے دل سے بھی اس کی تصدیق کرلو"۔

◉......بعض نے فرمایا: "اپنے ظاہر اور باطن کے تضاد کو دور کردو"

◉......بعض نے فرمایا: "اپنے قول اور فعل کے فاصلوں کو مٹادو"

◉......بعض نے فرمایا: "دورنگی چھوڑ دو، یک رنگ ہو جاؤ"

مشکلاتِ لا الہ:

دوسری آیت مبارکہ میں فرمایا:

﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً﴾

"تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ"

یعنی سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک تم مسلمان بن جاؤ۔ یاد رکھیں کہ مسلمان بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس کے لیے محنت چاہیے۔

چومی گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الہ

"جب میں یہ چاہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں کانپ اٹھتا ہوں کیونکہ لا الٰہ کی الا اللہ کی مشکلات سے میں واقف ہوں"

کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل کام ہے۔ اس دنیا میں آنا آسان اور صحیح معنوں میں انسان بن جانا، یہ بڑا مشکل کام، جو بنتا ہے یا بناتا ہے وہ ہی پتا پاتا ہے۔ جب بننے کے لیے محنت کرو گے تو پھر سمجھ لگے گی کہ یہ کام کتنا مشکل ہے! ؎

مصحفی ہم تو سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
سینے بیٹھے تو بہت کام رفو کا نکلا

حقائق کے آئینے میں ہماری کیفیت:

ہم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہم اپنے آپ سے پوچھیں کہ ہمارا کون سا عضو مسلمان ہے؟ تھوڑی دیر کے لیے اسی پر بیٹھ کر غور کریں...... کیا میری آنکھیں مسلمان بن گئیں؟...... اس لیے کہ جو آنکھیں مسلمان ہوں گی وہ غیر محرم پر بری نیت سے نہیں ڈالیں گے...... کیا میرے کان مسلمان بن گئے؟ کہ یہ خلافِ سنت باتیں نہیں سنیں گے...... کیا میری زبان مسلمان بن گئی؟ کہ اس سے کوئی بات خلاف شرع نہیں نکلے گی...... کیا میرے ہاتھ مسلمان بن گئے؟ کہ یہ اب کسی مسلمان کی جان، مال اور عزت پر نہیں اٹھیں گے...... کیا میرے پاؤں مسلمان بن گئے؟ کہ یہ پھر کسی گناہ کے لیے چل کر نہیں جائیں گے...... اگر ایسا نہیں تو ہمارے جسم کا کون سا عضو مسلمان ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؟؟

......دل ہے تو غیر کی محبت سے بھرا ہوا ہے۔

......ذہن ہے تو شہوانی اور شیطانی خیالات سے بھرا ہوا ہے۔

......آنکھ میلی ہے۔

......حرام حلال کی تمیز نہیں۔

تو پھر سوچیے کہ آخر مسلمانی کس چیز کا نام ہے؟ ؎

زبان سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہم اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک شعر بڑا ہی عجیب ہے! ؎

تو عرب ہے یا عجم ہے تیرا لاالٰہ الاّ
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

جب تک دل گواہی نہ دے ہمارا یہ لا الٰہ الا اللہ کہنا لغت غریب کی مانند ہے۔

ہماری یہ حالت بن چکی ہے کہ ہماری آنکھیں کھلی رہتی ہیں، گردن تنی رہتی ہے، ہم دوسروں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے عیب ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ اے کاش! یہ گردن جھک جاتی، یہ آنکھیں بند ہوتیں اور یہ نگاہیں اپنے سینے پر پڑتیں کہ میرے اپنے اندر کیا عیب چھپے ہوئے ہیں؟

منہ دیکھ لیا آئینے میں ، پر داغ نہ دیکھے سینے میں
جی ایسا لگایا جینے میں ، مرنے کو مسلماں بھول گئے
تکبیر تو اب بھی ہوتی ہے مسجد کی فضا میں اے انور!
جس ضرب سے دل ہل جاتے تھے وہ ضرب لگانا بھول گئے

ایک وقت تھا کہ یہ مومن، یہ نوجوان رات کے آخری پہر میں اٹھتا تھا، لا الٰہ الا اللہ کی ضربیں لگاتا تھا اور اس کے سینے میں دل کانپتا تھا۔ ؎

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

وہ سوز اور جذب ہم سے چھن چکا ہے۔ ؎

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

وہ نوجوان جو رات کے آخری پہر میں اٹھتے تھے وہ سسکیاں لے لے کر روتے تھے۔ اپنے رب کو مناتے تھے، ان کے آنسوؤں سے ان کے دامن تر ہو جاتے تھے۔ آج وہ چہرے نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر کی انگیٹھی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

ہمارے اندر کا انسان کہیں گم ہو چکا ہے۔ وہ کہیں کھو گیا ہے۔ وہ کہیں سو گیا ہے۔ اسے جگانے کی ضرورت ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ راہ روِ منزل ہی نہیں

ہمیں اپنے من کی دنیا کی بنانا ہے، اپنے من کی دنیا کو بسانا ہے اور اپنے اعمال پر محنت کرنی ہے۔ ہمارے اعمال کی حالت تو اتنی پتلی ہو چکی ہے کہ ایک مسجد میں امام صاحب نے سلام پھیر کر پوچھا: بھئی! میں نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ پوری مسجد میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو یقین سے کہتا کہ ہم نے دو پڑھی ہیں یا چار پڑھی ہیں۔ سب کہہ رہے تھے پتہ نہیں کتنی پڑھی ہیں۔ یہ قربِ قیامت کی علامت ہے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ "تم دیکھو گے کہ پوری مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی ہوگی مگر ان کے دل اللہ کی یاد سے خالی ہوں گے"۔ آج دلوں میں حضوری نہیں ہوتی۔ حاضری تو نصیب ہو جاتی ہے مگر حضوری سے محروم ہیں۔ ہم اللہ رب العزت سے حضوری بھی مانگیں اور اللہ رب العزت سے یہ دعا بھی کریں کہ وہ اندر کے

انگارے پھر سے روشن ہو جائیں۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو بیانِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا امانت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
وہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

ہمیں عشق الٰہی کی اس آگ کو بھڑکانا ہے تاکہ ہمارے اعمال میں جان پیدا ہو جائے۔شاعر نے کہا:۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہء سیماب

سیماب کہتے ہیں پارے کو۔وہ تھرکتا رہتا ہے۔کہتا ہے کہ میں نے مصر اور فلسطین میں بھی وہ اذان نہ سنی کہ جس کو سن کر پہاڑ بھی پارے کی طرح کانپتے تھے۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اس کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

آج اللہ کی زمین بھی تلاش کرتی ہے کہ کہاں گئے وہ لوگ جو اتنے خلوص سے سجدہ کرتے تھے کہ زمین بھی کانپ اٹھتی تھی۔ہماری حالت بھی یہی ہے۔

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں!؟

ہمیں آج دلوں پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے دل سِل بن چکے ہیں، پتھر بن چکے ہیں، ان کو موم کرنے کی ضرورت ہے۔ دو رنگی چھوڑنے کی ضرورت ہے ؎

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراسر موم ہو جا یا سنگ ہو جا

ہمارے اسلاف سراپا عمل تھے اور آج ہمارے پاس فقط باتیں ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سرِ دارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارہ

واقعی، ہماری زندگی عجیب بنتی چلی جا رہی ہے کہ زبان سے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، جب کہ اگر کوئی ہمارے عملوں کو دیکھے تو ہو وہ ہماری من مرضی کے ہوتے ہیں۔ اس فرق کو دور کرنے کے لیے اللہ والوں سے تعلق جوڑنا پڑتا ہے۔ پھر انسان کے اندر کا انسان بیدار ہوتا ہے۔ اور انسان کو دین کی روح نصیب ہوتی ہے۔ آج تو اکثر و بیشتر نوجوان آ کر کہتے ہیں: حضرت! دعا کریں، دماغ بہت گرم رہتا ہے۔ پتا نہیں آج کل کے نوجوانوں کی کیا پریشانی ہے!؟ وہ ہر وقت ٹینشن میں رہتے ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے: حضرت! بس غصے میں طلاق دے بیٹھا ہوں۔ ہم

نے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتاؤ! کبھی کسی نے خوشی میں بھی بیوی کو طلاق دی ہے؟ اپنے آپ پر قابو نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محنت نہیں کی۔ بلکہ جس کو چار پیسے مل جاتے ہیں وہ سرکاری سانڈ بنا پھرتا ہے۔ اس کو کچھ پروا نہیں ہوتی۔ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کا بندہ ہی نہیں سمجھتا۔

سب سے بری بیماری:

یاد رکھنا! بیماریوں میں سب سے بری بیماری دل کی بیماری ہے۔ اور دل کی بیماریوں میں سب سے بری بیماری دل آزاری ہوتی ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دوسرے بندے کی معمولی سی بات پر اس کی دل آزاری کر دیتے ہیں۔ ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ اس سے دوسرے کے دل پر چھری چل جاتی ہے۔ ہمیں پھر سے سیکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک مومن کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ اور اس کو سیکھنے کے لیے مشائخ کی خدمت میں کچھ وقت گزارنا پڑتا ہے۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا،

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامتی میں ہوں''

یعنی ان کا مال، ان کی جان اور ان کی عزت سلامت ہو۔ ایسا آدمی صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کا حق دار ہے۔ ہم ذرا اپنے آپ سے پوچھیں کہ کیا اس تعریف پر ہم پورے اترتے ہیں؟ ہم نے تو اللہ کے بندوں کو پریشان کر رکھا ہے۔

- ...... خاوند نے بیوی کے ناک میں دم کیا ہوتا ہے،
- ...... بیوی نے خاوند کو ستایا ہوا ہوتا ہے،
- ...... ساس اور بہو کے اندر چپقلش ہوتی ہے،

- ......نند اور بھابھی کے درمیان عجیب کہانیاں ہوتی ہیں،
- ......پڑوسی اور پڑوسی کے درمیان جھگڑے ہوتے ہیں،
- ......سگے دو بھائی ایک دوسرے کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔

سوچیں کہ اسلام ہمیں کیا سکھاتا ہے اور عملی طور پر ہماری زندگی کیسے گزر رہی ہے!؟

دین سراسر خیر خواہی ہے:

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ "دین سراسر خیر خواہی ہے"

کیا مطلب؟ کہ مومن دوسرے مومن کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ یاد رکھنا! جہاں آپ کو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بدخواہ نظر آئے تو سمجھ لینا کہ دین کی دھجیاں اڑ چکی ہیں۔

ایثار کے انمٹ نقوش:

دینِ اسلام نے ہمیں ایثار کا سبق دیا ہے۔ اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگیوں میں انوکھی مثالیں قائم کی ہیں۔ ایک مجاہد زخمی حالت میں کہتے ہیں: اَلْعَطَشْ اَلْعَطَشْ "پیاس پیاس"۔ ان کے کزن کہتے ہیں کہ میں مشک لے کر آگے بڑھا کہ پانی پلاؤں، مگر جب وہ پینا چاہتے تھے تو ایک اور مجاہد نے کہا: اَلْعَطَشْ "پیاس"۔ چنانچہ اس نے اپنا منہ بند کر لیا اور اشارہ کیا کہ اس کو پلایئے۔ میں ادھر گیا۔ وہ پینا ہی چاہتا تھا کہ تیسری طرف سے آواز آئی، العطش (پیاس)۔ اس نے بھی اپنا منہ بند کر لیا اور اس کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ تیسرے کے پاس پہنچا تو میرے جانے سے پہلے وہ شہید ہو چکا تھا۔ جب لوٹ کر دوسرے کے پاس آیا کہ اسے پلا دوں تو وہ بھی شہید ہو چکا تھا، پھر جب لوٹ کر پہلے کے پاس آیا تو وہ بھی شہید ہو چکا تھا۔ وہ زندگی کے آخری لمحے میں بھی اپنے بھائی کو اپنے اوپر ترجیح دیا کرتے

تھے۔اسی حقیقت کو قرآن مجید نے یوں آشکار کیا:

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (الحشر ۹)

ابوالحسن نوری سے بادشاہِ وقت نے اپنی مرضی کا کوئی فتویٰ مانگا، مگر انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے تین علما کو گرفتار کروایا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کو سزا دی جائے۔لہٰذا غصے میں آکر اس نے ان کے قتل کے احکام جاری کر دیے۔

جب جلاد قتل کرنے لگا تو بادشاہ نے دیکھا کہ ابوالحسن نوری ﷫ سب سے آگے کھڑے ہیں۔اسے ان کے ساتھ عقیدت بھی تھی۔وہ چاہتا تھا کہ باقی دو کو تو قتل کر دیا جائے اور ان کو میں کسی بہانے سے معاف کر دوں۔اس لیے وہ کہنے لگا کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ، ان کو فلاں جگہ پر قتل کرو۔اس کا مقصد تھا کہ ان کی ترتیب بدل جائے گی۔جب دوسری جگہ پر ان کو دیکھا تو ابوالحسن نوری ﷫ پھر آگے کھڑے تھے۔وہ بڑا حیران ہوا اور اس نے ان کو قریب بلایا اور کہا کہ یہاں ان کو قتل کرو۔تیسری جگہ پھر ابوالحسن نوری ﷫ آگے کھڑے ہوگئے۔بادشاہ نے حیران ہو کر اب ان کو اپنے قریب بلا لیا اور حقیقت بتا دی کہ میں چاہتا تھا کہ پہلے دوسروں کو قتل کر دیا جاتا، مگر ہر دفعہ آپ ہی آگے کھڑے نظر آئے، آخر کیا وجہ ہے؟ ابوالحسن نوری ﷫ نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جب میں آگے کھڑا ہوں تو جتنی دیر اس جلاد کو مجھے قتل کرنے میں لگے گی میرے ان بھائیوں کو اتنی دیر کے لیے زیادہ زندہ رہنے کا موقع مل جائے گا۔

جب ہم صحیح معنوں میں مسلمان تھے......

ایک وقت تھا کہ جب مسلمانوں کے پڑوس کی قیمت زیادہ ہوا کرتی تھی۔عبداللہ بن مبارک کے پڑوس میں ایک یہودی تھا۔وہ مکان بیچنا چاہتا تھا۔ ایک خریدار آیا اور اس نے پوچھا: جی آپ نے یہ مکان کتنے میں بیچنا ہے؟ اس نے کہا کہ دو ہزار دینار میں۔ لینے والے نے کہا: بھئی! اس علاقے میں تو ایسے مکان کی

قیمت ایک ہزار دینار ہوتی ہے اور آپ مجھ سے دوگنا قیمت مانگ رہے ہیں۔ یہودی کہنے لگا: ہاں! ایک ہزار دینار میرے مکان کی قیمت ہے اور دوسرا ہزار دینار عبداللہ بن مبارک کے پڑوس کی قیمت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے اخلاق ایسے ہوتے تھے کہ ہر ایک کا بھلا سوچتے تھے اور پھر ہمارے پڑوس کے مکانوں کی قیمتیں بڑھ جایا کرتی تھیں۔ لوگ ہمارے عملوں کو دیکھ کر مسلمان ہوتے تھے۔

ایک نوجوان کی دیانتداری کا واقعہ:

ایک نوجوان مسلمان پردیس میں تھا۔ چھٹی کے دن شکار کھیل رہا تھا۔ جب اس نے تیر مارا تو اس کا نشانہ خطا ہو گیا اور تیر ایک عیسائی لڑکے کو جا لگا۔ لڑکے نے وہیں جان دے دی۔ لڑکے کے والدین نے اسے پکڑ لیا۔ دوسرے عیسائیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ مقدمہ چلاؤ، قاضی مسلمان ہے، تمہیں یقیناً انصاف ملے گا۔ چنانچہ وہ بہت خوش ہوئے۔

جب مقدمہ چلا تو قاضی نے اس نوجوان سے پوچھا: کیا آپ کا تیر لگنے سے وہ لڑکا فوت ہوا؟ نوجوان نے کہا: جی ہاں، مگر یہ قتلِ خطا ہے، قتلِ عمد نہیں، میں نے پرندے کو مارنے کے لیے نشانہ باندھا تھا مگر غلطی سے لڑکے کو جا لگا۔ قاضی نے کہا: جو بھی ہے، تم ان لوگوں کو مطمئن کر دو، اگر یہ مطمئن ہو جائیں تو ٹھیک، ورنہ جان کے بدلے جان والا معاملہ ہو گا۔ اب اس نے ان کو مطمئن کرنے کی بڑی کوشش کی، مگر وہ عیسائی ڈٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کو پھانسی پر چڑھتا دیکھیں گے تب ہمارے بچے کا انتقام پورا ہو گا۔ چنانچہ قاضی نے اس کی پھانسی کا حکم دے دیا۔ ان دنوں جمعہ کے دن جمعہ کی نماز پڑھ کر بڑے مجمع میں سب مجرموں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ قاضی صاحب نے اس کو جیل بھیج دیا۔ رات اس نے وہیں جیل میں گزاری۔

اس وقت کا جیل سپر نٹنڈنٹ (جس کو جیلر کہتے ہیں) عیسائی تھا۔ یہ نوجوان اگلی صبح اس عیسائی جیلر کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں مسلمان ہوں، مجھ سے غلطی ہوئی ہے، بچہ قتل ہو گیا ہے، جمعہ کے دن مجھے سزا ملنی ہے، حد قائم ہونی ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں واپس اپنے دیس میں جا کر بیوی بچوں سے ملاقات بھی کر لوں اور ان کو اطلاع بھی دے دوں، امانتیں بھی واپس کر دوں اور قرض بھی لوٹا دوں، اگر آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں تو میں اگلے جمعہ سے پہلے پہلے واپس آ جاؤں گا، اور میں مسلمان ہوں۔ جب اس نے کہا کہ میں مسلمان ہوں تو اس سپر نٹنڈنٹ نے کہا: بہت اچھا! میں اپنی ذمہ داری پر آپ کو آزاد کرتا دیتا ہوں، آپ جمعہ کی نماز سے پہلے پہنچ جانا۔ کافر کے دل میں بھی ایک مسلمان کا اتنا اعتماد تھا! چنانچہ وہ قتل کا مجرم گھر چلا گیا۔

جب جمعہ کا دن آیا تو لوگ قاضی صاحب کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ اس نے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا کہ وہ قتل کا مجرم کہاں ہے؟ جیلر نے کہا: جناب! میں نے اپنی ذمہ داری پر اس کو چھوڑ دیا تھا۔ قاضی نے کہا: باقی حدود قائم ہونے تک وہ آ گیا تو فبہا، نہ آیا تو پھر اس کی جگہ آپ کو پھانسی دی جائے گی کیونکہ آپ نے اسے چھوڑا ہے۔ اب عیسائی اور پریشان ہو گئے کہ بچہ بھی ہمارا مرا ہے اور اس کے بدلے بندہ بھی ہمارا پھانسی چڑھے گا۔

اللہ کی شان دیکھیے کہ جب باقی سب کیس نمٹ گئے تو قاضی نے اس نوجوان کو طلب کیا۔ مگر ابھی تک وہ نہیں پہنچا تھا۔ چنانچہ قاضی نے کہا کہ جیلر آگے آئے۔ اس کو پھانسی دی جائے گی۔ جب جیلر آگے بڑھا تو عیسائیوں نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو ان کو دور سے ایک سایہ سا نظر آیا۔ لوگوں نے کہا: قاضی صاحب! تھوڑی دیر انتظار کیجیے، کوئی آ رہا ہے۔ قاضی صاحب نے تھوڑی دیر انتظار کیا تو دیکھا کہ ایک نوجوان بھاگتے بھاگتے پسینے میں شرابور وہاں پہنچا۔ وہ وہی نوجوان تھا۔

اس نے آتے ہی اس عیسائی جیلر سے معافی مانگی اور کہا کہ میں وقت پر ہی چل پڑا تھا، مجھے کشتی کے ذریعے دریا عبور کرنا تھا، ہوا مخالف سمت کی تھی، چنانچہ بہت کوشش کے باوجود دریا عبور کرنے میں بہت دیر لگی، جس کی وجہ سے عہد کے مطابق پہنچنے میں تاخیر ہوئی ہے لہٰذا مہربانی فرما کر مجھے معاف کر دیں، اب میں حاضر ہوں۔ جب اس نوجوان کے ایفائے عہد کے اس واقعہ کو عیسائیوں نے دیکھا تو وہ کہنے لگے: قاضی صاحب! آپ نے اس نوجوان کی بات بھی سن لی، اب ذرا ہماری بات بھی سن لیجیے کہ جب یہ اپنے قول کا اتنا پکا اور سچا ہے تو ہم فقط اس کی ہی جان بخشی نہیں کرتے بلکہ ہم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان بھی کرتے ہیں۔

مسلمان معاشرے میں خیر خواہی کا عالم:

جس زمانے میں بغداد مسلمانوں کا مرکز تھا، اس وقت کافروں نے ایک نوجوان کو بغداد میں بھیجا کہ ذرا مسلمانوں کے ماحول معاشرے کا پتہ کر کے آؤ کہ ان کے اندر وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے یہ پوری دنیا میں غالب آتے جا رہے ہیں؟

جب وہ بغداد میں پہنچا تو اس وقت وہ تھکا ہوا بھی تھا اور اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ میں ہوٹل سے کھانا کھا لیتا ہوں۔ وہ ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے گیا۔ جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ کوئی دوسرا بندہ اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ یہ سمجھا کہ میں اس کے لیے پردیسی اور اجنبی ہوں، شاید اسی وجہ سے مجھے بار بار دیکھ رہا ہے۔ جب وہ کھانا کھانے کے بعد پیسے ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر پر آیا تو کاؤنٹر والے نے کہا: جناب! آپ کی پیمنٹ ہو چکی ہے۔ اس نے پوچھا: جی! میری پیمنٹ کیسے ہو چکی ہے؟ اس نے کہا: آپ کے سامنے ایک مسلمان بیٹھا تھا، اس نے دیکھا کہ آپ پردیسی ہیں، وہ اپنے پیسے بھی دے گیا اور یہ کہہ کر گیا کہ یہ بھائی آج میرا مہمان ہے، لہٰذا اس کے پیسے بھی میں ادا کر دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ

آپ کی پیمنٹ بھی کر کے چلا گیا، اور اس کو اتنی طمع بھی نہیں تھی کہ وہ آپ کو اطلاع دیتا اور آپ کی زبان سے شکریہ کا لفظ سن لیتا۔ یہ سن کر وہ حیران ہوا کہ مسلمان ایسے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد وہ آگے بڑھا ایک دکان پر اسے کوئی چیز خریدنی تھی۔ چنانچہ اس نے دکاندار سے پوچھا: کیا آپ کے پاس فلاں چیز موجود ہے؟

دکاندار نے کہا: ہاں موجود ہے۔

اس نے پوچھا: اس کی کتنی قیمت ہے؟

دکان دار نے کہا: اتنی

اس نے کہا: اچھا! آپ مجھے ایک عدد دے دیجیے۔

دکان دار نے کہا: جناب! آپ میری ایک بات مان لیجیے کہ یہی چیز آپ کو سامنے والی دکان سے اسی دام میں مل جائے گی، آپ وہاں سے خرید لیں۔

چنانچہ یہ وہاں پہنچا اور اسے وہی چیز اتنے ہی دام میں وہاں سے مل گئی۔ مگر اس کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ پہلے دکاندار نے انکار کیوں کیا؟ لہٰذا وہ لوٹ کر پہلے کے پاس آیا۔

اس نے پوچھا: جناب کیا آپ کے پاس یہ چیز موجود نہیں تھی، یا آپ دینا نہیں چاہتے تھے؟

دکان دار نے کہا: جناب! میرے پاس یہ چیز موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ آج میرے پاس اتنے گاہک آچکے ہیں کہ میرے بیوی بچوں کا گزارا اچھا ہو جائے گا، میں نے دیکھا کہ میرے سامنے والے بھائی کے پاس آج تھوڑے گاہک آئے ہیں، میں نے سوچا کہ اگر آپ اس سے کوئی چیز خرید لیں گے تو اسے بچت ہو جائے گی اور آج رات اس کے بیوی بچوں کا گزارا ہو جائے گا۔

ایک وقت تھا کہ دکاندار ایک دوسرے کے اتنے خیر خواہ ہوتے تھے۔

اسلام کا بول بالا:

کاندھلہ انڈیا کا ایک بڑا قصبہ ہے..... اللہ نے مجھے وہاں جانے کا موقع نصیب کیا..... تقسیمِ ہند سے بہت پہلے کی بات ہے، وہاں ایک زمین کا ٹکڑا تھا جس پر ایک مسلمان اور ہندو کا جھگڑا ہوا۔ مسلمان کہتا تھا کہ یہ میرا ہے اور ہندو کہتا تھا کہ یہ میرا ہے۔ جب بات ذرا زیادہ بڑھی تو مسلمان نے کہہ دیا کہ اگر یہ ٹکڑا مجھے مل گیا تو میں مسجد بناؤں گا۔ ہندو نے بھی کہہ دیا کہ اگر مجھے مل گیا تو میں اس پر مندر بناؤں گا۔ لو، بات تو ذاتی تھی مگر وہ مذہبی معاملہ بن گیا۔

ادھر سے مسلمان آ گئے اور کہنے لگے کہ ہم مسجد بنا کے رہیں گے اور ادھر سے ہندو آ گئے اور کہنے لگے کہ ہم مندر بنا کے رہیں گے۔ یوں پورے شہر کے اندر آگ سی لگ گئی۔ چنانچہ انگریز پریشان ہوا کہ یہ کیا معاملہ بنا۔ اگر ذرا سی بے احتیاطی ہوئی تو یہاں نالیوں میں خون بہنا شروع ہو جائے گا اور مصیبت بن جائے گی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو عدالت میں بلوایا۔ دونوں طرف سے جمِ غفیر وہاں پہنچ گیا۔

انگریز جج نے پوچھا: کوئی صلح کی صورت ہو سکتی ہے، تاکہ افہام و تفہیم سے اس مسئلے کو سلجھایا جائے۔ ہندوؤں نے کہا: ہاں! ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم آپ کو ایک مسلمان کا نام بتائیں گے، آپ ان کو بلا کر پوچھ لیجیے، اگر وہ یہ کہیں کہ یہ ٹکڑا مسلمانوں کا ہے تو زمین ان کو دے دیں اور اگر وہ کہیں کہ ہندوؤں کا ہے تو زمین ہمیں دے دیں۔ جج نے اگلی تاریخ ڈال دی اور کہا کہ ہاں، ایسا ہی کر لیا جائے گا۔

بالآخر اگلی تاریخ آ گئی،

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے

پھر عدالت میں لوگوں کا مجمع پہنچا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس وقت ایک بڑے شیخ

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی وہاں جج کی کرسی کے قریب بیٹھے ہیں۔ انگریز جج نے ان کو ہندوؤں کی نشاندہی پر بلایا تھا۔

جج نے پوچھا: مفتی صاحب! یہ زمین کا ٹکڑا کس کا ہے؟

مفتی صاحب نے جواب دیا: اس ہندو کا۔

جج صاحب نے پوچھا: مفتی صاحب! کیا ہندو یہاں پر مندر بنا سکتے ہیں؟

مفتی صاحب نے فرمایا: جب ملکیت ان کی ہے تو اختیار بھی ان کا ہے۔ وہ چاہیں تو مندر بنائیں، چاہیں تو اپنا گھر بنائیں۔

جب انہوں نے یہ جواب دیا تو مسلمانوں کے دل بہت زیادہ ڈوب گئے۔ اس کے بعد انگریز نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس تاریخی فیصلے میں اس نے کہا:

''آج مسلمان تو ہار گئے مگر اسلام جیت گیا''

جب ہندوؤں نے جج کا فیصلہ سنا تو انہوں نے کہا:

''جج صاحب! آپ ہمارا فیصلہ بھی سن لیجیے کہ جب اسلام جیت گیا، جو ایسا اچھا اور کھرا مذہب ہے، تو ہم بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے ہیں۔ اب اس جگہ پر ہم اپنے ہاتھوں سے مسجد بنائیں گے۔''

تو ایک وقت تھا جب ہمارے قول و فعل کو دیکھ کر کافر بھی مسلمان ہو جاتے تھے۔ آج ہماری زندگی کیسی بنی ہوئی ہے! ہمیں اس مسلمانی کی لاج رکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم سے تو بہروپیا اچھا......!!!

اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں ایک بہروپیا اپنا بھیس بدل کر آیا۔ بادشاہ نے پہچان لیا۔ بہروپیے نے انعام مانگا کہ میں نے سانگ رچایا ہے۔ بادشاہ نے کہا: بھئی! میں نے تو پہچان لیا ہے، جب نہیں پہچان سکیں گے تو انعام بھی دیں گے۔

بہروپیے نے کہا: بہت اچھا۔ چنانچہ وہ چلا گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ میں کونسا روپ اختیار کروں کہ ان کو پتہ نہ چل سکے؟ بالآخر اس کے دل میں بات آئی کہ بادشاہ اللہ والوں کا بڑا قدر دان ہے۔ یہ خیال آنے کے بعد اس نے شہر کے باہر جا کر ایک جگہ اپنی جھونپڑی لگالی اور اللہ ہو کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ جو آدمی بھی پاس جاتا وہ اسے واپس بھیج دیتا۔ جب اسی طرح وہ ذکر میں لگا رہا تو آہستہ آہستہ اس کی شہرت ہو گئی۔ لوگوں نے آکر دعائیں کروانا شروع کر دیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کو بھی ان کا پتہ چل گیا۔ ان کی عادت تھی کہ جب ان کو پتا چلتا کہ کوئی اللہ والا ہے تو خود اس کے پاس ملنے کے لیے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ خود بھی گئے اور اپنے اور وزرا کو بھی لے کر گئے۔ ان سے دعا کروائی اور ہزاروں دیناروں سے بھری ایک تھیلی ان کو ہدیے کے طور پر پیش کی۔ انہوں نے کہا: جی نہیں، ہمیں ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے! ان کی تم دنیا داروں کو ضرورت ہوتی ہے، لے جاؤ اپنے ساتھ۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اور زیادہ معتقد ہوئے کہ یہ بندہ تو بے غرض اور بے طمع ہو کر اللہ اللہ کر رہا ہے۔ چنانچہ تھیلی لے کر واپس چلے گئے۔

ابھی اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ جا کر دربار میں بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں وہ بہروپیا آکر کہنے لگا: بادشاہ سلامت! السلام علیکم

بادشاہ نے کہا: وعلیکم السلام

بہروپیے نے کہا: بادشاہ سلامت! انعام دیجیے۔

بادشاہ نے پوچھا: بھئی! کس بات کا انعام؟

اس نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ مجھے نہیں پہچان سکے۔

بادشاہ نے پوچھا: بھئی! میں کیسے نہیں پہچان سکا؟

اس نے پوچھا: جی! آپ ابھی جس بندے سے مل کے آئے ہیں وہ کون تھا؟

بادشاہ نے کہا: وہ ایک اللہ والا تھا۔

بہروپیے نے کہا: بادشاہ سلامت! وہ میں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایسا بنا کر پیش کیا کہ آپ نہ پہچان سکے، لہٰذا آپ مجھے انعام دیجیے۔

بادشاہ بڑا حیران ہوا اور اس نے اسے انعام دیا۔ لیکن انعام تھوڑا تھا۔

بہروپیے نے کہا: بادشاہ سلامت! انعام تو بہت کم ہے۔

بادشاہ نے کہا: میں تو بس یہی دے سکتا ہوں۔ ہاں! جب تم وہاں تھے تو میں نے تو دیناروں سے بھرا ہوا تھیلا پیش کیا تھا، تم اس وقت قبول کر لیتے تو پورا تھیلا تمہارا ہوتا۔ اب کیوں انعام کی کمی کا شکوہ کر رہے ہو؟

بہروپیے نے کہا: بادشاہ سلامت! جب آپ نے مجھے تھیلا دیا تھا تو خیال میرے دل میں بھی آیا تھا کہ اچھا موقع ہے، تھیلا ہی لے لیتا ہوں، مگر پھر دل میں خیال آیا، نہیں، اگر چہ تو بہروپیا ہے مگر اللہ والوں کا بھیس بنا کے بیٹھا ہوا ہے۔ اگر تو نے تھیلا قبول کر لیا تو اللہ والوں کی مسند بدنام ہو جائے گی کہ اللہ والے بھی اس طرح ہدیے قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا میں نے وضع قطع کا لحاظ رکھا اور میں نے تھیلے کو ٹھوکر لگا دی۔

آپ سوچیے تو سہی کہ ہم سے تو بہروپیا اچھا، جس نے اپنے بہروپ کا بھی لحاظ رکھا اور ایسا کوئی کام نہ کیا جو اللہ والوں کی شان کے خلاف ہو۔ ہم نے بھی کلمہ پڑھا ہے۔ ہم بھی مسلمان کہلاتے ہیں، ہم کیوں ایسا کام کرتے ہیں جو ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔

نسبتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر:

جامع مسجد دہلی کے سیڑھیوں پر فقیر بھیک مانگنے کے لیے بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک انگریز آیا۔ وہ مسجد میں کوئی ڈیزائن دیکھنا چاہتا تھا۔ جب سیڑھیاں چڑھنے لگا تو ایک مسلمان فقیر اس کی طرف بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا: مجھے کچھ دے دیجیے۔ اس انگریز

نے بٹوہ نکالا اور اس کو کچھ پیسے دے دیے اور بٹوہ جیب میں ڈال کر چلا گیا۔

اللہ کی شان، کہ اس کو مسجد کا وہ ڈیزائن پسند آیا اور بیوی کو جا کر بتایا۔ بیوی نے کہا کہ مجھے بھی اگلے ہفتے وہ ڈیزائن دکھائیں۔ کہنے لگا: بہت اچھا۔ رات کو اسے محسوس ہوا کہ جو بٹوہ اس نے جیب میں ڈالا تھا وہ جیب میں نہیں تھا اور وہ راستے میں ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس میں تین چار سو روپے بھی تھے۔ اس زمانے میں مہینے کی تنخواہ ہی روپیہ یا دو روپیہ ہوتی تھی تو تین چار سو روپے تو بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ خیر اس نے کہا کہ اب تو وہ گم ہو گیا ہے، کیا کریں۔ چنانچہ بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے ہفتے وہ اپنی بیوی کو لے کر دوبارہ مسجد کی طرف گیا۔ اب جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہی فقیر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اپنا تھیلا نیچے رکھا اور اس میں سے اس کا بٹوہ نکالا اور کہنے لگا: صاحب! آپ کا یہ بٹوہ یہاں گر گیا تھا، میں نے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر آپ نکل گئے۔ میں نے اس وقت سے یہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ آپ یہ لے لیجیے۔ جب اس نے بٹوہ دیکھا تو اس میں پوری کی پوری رقم موجود تھی۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ پیسہ پیسہ مانگنے والا، اسے تین چار سو روپے مل گئے تھے، اس نے خود کیوں نہ استعمال کر لیے: پھر یہ ایک ہفتے تک میرا انتظار بھی کرتا رہا۔

چنانچہ اس نے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ تم نے میرے پیسے استعمال نہ کیے۔ فقیر نے جواب دیا کہ میرے دل میں بھی یہ بات آئی تھی کہ میں ان پیسوں کو استعمال کر لوں، لیکن مجھے فوراً ایک خیال آیا جس کی وجہ سے میں نے ایسا نہ کیا۔ اس نے پوچھا: آپ کو کون سا خیال آیا؟ فقیر کہنے لگا: میں مسلمان ہوں، آپ عیسائی ہیں، میرے دل میں خیال آیا کہ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن یہ مقدمہ اللہ کے سامنے پیش کیا جائے اور آپ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میرے نبی حضرت محمد ﷺ کو شکوہ کریں کہ آپ کے

امتی نے میرے امتی کے پیسے چرائے تھے۔اس خیال کے آنے کے بعد میں نے پیسوں کو استعمال نہ کیا اور میں نے آپکا انتظار کیا۔اب آپ کی امانت آپ کے پاس موجود ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سے تو وہ فقیر اچھا تھا، اسے بھی اس نسبت کا لحاظ تھا، ہمیں بھی اس نسبت کا لحاظ ہونا چاہیے۔

معافی مانگنے سے پہلے معاف کر دیا:

ایک بزرگ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ حج پر گئے ہوئے تھے۔ایک جگہ جا رہے تھے اور ان کا تھیلا ان کے ہاتھ میں تھا۔ایک نوجوان آیا اور ان سے ان کا تھیلا چھینا اور بھاگ گیا۔ذرا آگے گیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔جیسے بینائی چلی گئی۔اس نے رونا شروع کر دیا۔لوگوں نے پوچھا: کیوں روتے ہو؟ کہنے لگا: میں نے فلاں جگہ پر ایک بوڑھے میاں کا تھیلا چھینا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی مقبول بندے تھے کہ میری بینائی چلی گئی۔مجھے ان کے پاس لے چلو، میں ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔

چنانچہ لوگ اس کو اس جگہ پر لے گئے۔وہاں وہ بڑے میاں نہیں تھے۔قریب ہی ایک حجام تھا۔اس سے پوچھا: تو کہا کہ وہ نماز پڑھنے آتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں، آپ اگلی نماز تک انتظار کریں، میں نشاندہی کر دوں گا۔

اگلی نماز تک وہ بزرگ آگئے۔اس حجام نے ان کی نشان دہی کر دی۔اب وہ نوجوان ان سے معافی مانگنے لگا اور کہنے لگا: حضرت! آپ مجھے معاف کر دیں، مجھ سے غلطی ہوگئی، میں بڑا شرمندہ ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔وہ فرمانے لگے کہ میں نے تو آپ کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔جب بار بار اس نے معافی مانگی اور بار بار انہوں نے کہا کہ میں نے تو اسی وقت آپ کو معاف کر دیا تھا تو لوگ بڑے حیران ہوئے۔کسی

نے پوچھا: حضرت! اس نے آپ کا تھیلا چھینا اور آپ کہتے ہیں کہ میں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا! وہ بزرگ کہنے لگے: ہاں مجھے ایک خیال آ گیا تھا جس کی وجہ سے میں نے معاف کر دیا تھا۔ پوچھا: کیا خیال آ گیا تھا؟

اس نے کہا: میں نے علما سے مسئلہ سنا ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن میری امت کو حساب کتاب کے لیے پیش کیا جائے گا، جب تک پوری امت کا حساب کتاب پورا نہیں ہو جائے گا میں اس وقت تک جنت میں قدم نہیں رکھوں گا''۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس نے میرا تھیلا چھینا، اگر میں نے معاف نہ کیا تو قیامت کے دن میرا یہ مقدمہ پیش ہوگا، اور جتنی دیر اس مقدمے کے فیصلے میں لگے گی، میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں جانے میں اتنی دیر ہو جائے گی، میں نے معاف کر دیا کہ نہ مقدمہ پیش ہوگا اور نہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں جانے میں دیر لگے گی۔

کاش! ہمیں بھی اس نسبت کا لحاظ ہوتا اور ہم بھی اپنے جھگڑے سمیٹ لیتے۔ ہم نے آج زندگی کے اندر کتنے معاملات کو بکھیرا ہوا ہے! ہم بھی اس نسبت کی لاج رکھیں۔ یہ نسبت بڑی عجیب ہے۔

رہے سلامت تمہاری نسبت:

عزیز طلبا! ہمارے پاس تو نسبت کے سوا ہے ہی کچھ نہیں۔

عمل کی اپنے اساس کیا ہے!
بجز ندامت کے پاس کیا ہے!
رہے سلامت تمہاری نسبت
مرا تو بس آسرا یہی ہے

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو یہ چٹائیوں پر بیٹھ کر حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھنے کی نسبت دی ہے یہ بڑی نسبت ہے۔ اس نسبت کی لاج رکھیے۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے

دن پوچھ لیا جائے کہ دوسرے تو عوام الناس تھے، ان سے کیا گلہ، آپ لوگ تو قرآن و حدیث پڑھنے والے تھے، تم نے ہی کچھ نسبت کی لاج رکھ لی ہوتی اور اپنی زندگی کو تم نے ہی اسلام کے مطابق ڈھال لیا ہوتا، تو سوچیے کہ پھر اللہ کے محبوب ﷺ کے سامنے ہم کیا جواب دے سکیں گے؟ اس لیے کہنے والے نے کہا:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

''اے اللہ! تو دو عالم سے غنی ہے، میں فقیر ہوں''

گر تو بینی حسابم ناگزیر

''اے اللہ! اگر تو فیصلہ کر لے کہ میرا احساب لینا لازمی ہے''

از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

''اے اللہ! مصطفےٰ کریم کی نگاہوں سے اوجھل حساب لے لینا''

تاکہ کہیں ان کے سامنے شرمندگی نہ ہو، آقا ﷺ یہ نہ کہہ دیں کہ تو نے میرے آنسوؤں کی قدر نہ کی، میں تو راتوں کو رورو کے امت کی مغفرت کی دعائیں کرتا تھا، تو میرا اوارث کیسے بنا کہ تو نے پڑھنے کے باوجود اپنی زندگی کو نہ بدلا۔

آج ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا عہد کریں، پچھلے گناہوں سے سچی توبہ کریں اور آئندہ اسلامی، ایمانی اور قرآنی زندگی بسر کرنے کا دل میں ارادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں کامیاب اور کامران فرمادے اور قیامت کے دن کی ذلت و رسوائی سے ہمیں محفوظ فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اندر کے انسان کو جگادے اور ہمیں صحیح معنوں میں سچا پکا مومن مسلمان بنادے۔ (آمین ثم آمین)

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ ﴾

درخت میں پوشیدہ اسرار

بیان: پیرِ طریقت حضرت مولانا حافظ ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی
دامت برکاتہم

اقتباس

صندل کا درخت اس کلہاڑے کے منہ کو بھی خوشبودار بنا دیتا ہے جو کلہاڑا اسے کاٹتا ہے۔ گویا اس نے برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دیا۔ ہم بھی ایسے بن جائیں۔ فطرت ہمیں یہ سبق سکھا رہی ہے کہ ہم بھی برائی کے بدلے میں اچھائی کا معاملہ کریں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ اسے اخلاق حمیدہ تو نہیں کہتے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

درخت میں پوشیدہ اسرار

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
﴿ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا ۝ وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾
(ق:٦ تا ٨)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

بندۂ حر کے لیے نہیں ہے فراغ:

انسان درخت نہیں کہ کھڑا رہے، پتھر نہیں کہ پڑا رہے، یہ تو اشرف المخلوقات ہے، اسے چاہیے کہ یادِ الٰہی میں لگا رہے۔ مقصدِ زندگی اللہ رب العزت کی بندگی ہے اور مقصدِ حیات اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ انسانی جسم چکی کی مانند ہے۔ چکی اگر گیہوں پیسے تو اس کا فائدہ ہے اور اگر بند رہے تو بے فائدہ ہے۔ اسی طرح اگر انسانی جسم سے نیک اعمال صادر ہوتے رہیں تو اس جسم کا فائدہ ہے اور اگر انسان کے جسم سے اعمال صادر نہ ہوں تو یہ بے فائدہ ہے۔ ہمیں اجرامِ فلکی چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آسمان کے سیاروں اور ستاروں کو دیکھیں، یہ متحرک نظر آتے ہیں۔ اس میں انسان کے لیے

ایک خاموش پیغام ہے کہ اے انسان! تجھے بھی اپنی زندگی کو متحرک بنانا چاہیے۔

ملی ہے فرصت فقط غلاموں کو
جہاں میں بندۂ حر کے لیے نہیں ہے فراغ

جو غلام ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں ان کے پاس بڑی فرصت ہوتی ہے، بڑا وقت فارغ ہوتا ہے اور جو بندۂ حر ہوتا ہے، یعنی جو کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں وہ دنیا میں عدیم الفرصت ہوتے ہیں۔

درسِ فطرت:

ہم اگر اپنے ارد گرد غور کریں تو ہمیں فطرت یہ سبق دیتی نظر آتی ہے کہ اے انسان! تو دنیا میں ایک مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے، اگر تو اس مقصد کے مطابق زندگی گزارے گا تو تو کامیاب ہوگا۔

درخت میں پوشیدہ اسرار و رموز

ہمارے لیے درخت میں بہت سے سبق موجود ہیں اور اس میں بڑی عجیب و غریب باتیں پوشیدہ ہیں مثال کے طور پر:

درخت کا زمین کے اندر اگنے میں راز:

آپ نے غور کیا ہوگا کہ درخت ہمیشہ زمین میں اگتا ہے، سونے اور چاندی کی پلیٹ میں نہیں اگتا۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ اے انسان! اگر تو کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے تو تجھے اسی ماحول اور معاشرے میں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا پڑے گا، تب تو صحیح نشو و نما پا سکے گا۔ اگر تو جنگلوں اور غاروں میں جا کر ترقی حاصل کرنا چاہے گا تو وہاں تجھے نہیں ملے گی۔

بیج زمین کے اندر بونے میں حکمت:

جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہی درخت بنتا ہے۔تو درخت کیسے بنا؟ جب بیج نے اپنے آپ کو مٹا دیا۔ جب دانے نے اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا تو اللہ رب العزت نے اس دانے کو درخت بنا دیا۔ پھر اس درخت پر پھل لگتے ہیں اور ایک دانے سے ہزاروں دانے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی انسان اپنی ''میں'' کو مٹا دیتا ہے، اپنی انانیت کو توڑ دیتا ہے تو پھر اللہ رب العزت اس کو وہ مقام عطا فرماتے ہیں جس سے وہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے انسان بننے کا سبب بن جاتا ہے۔

ایک بیج کی قربانی میں انسانیت کے لیے پیغام:

ایک بیج نے قربانی دی، درخت بنا، اور اس درخت نے انسانوں اور جانوروں کو سایہ دیا۔ اسی طرح جو انسان اپنے نفس کی قربانی دیتا ہے اور اس کو شریعت کی لگام پہنا لیتا ہے، پھر اللہ رب العزت اسے قدآور درخت کی مانند بنا دیتے ہیں اور وہ دوسرے انسانوں کے لیے سایہ دار درخت بن جاتا ہے۔ وہ اکیلا ہوتا ہے، مگر ہزاروں لوگوں کے لیے سائبان کی مانند ہوتا ہے۔

ہمیں ایک ملک میں باغ دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں پر ہم نے الائچی کا درخت دیکھا...... یہی الائچی جو ہم منہ میں ڈالتے ہیں اور خوش بو آتی ہے۔...... تو بتانے والے نے کہا اسے شیڈ وٹری کہا جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا شیڈ وٹری کا کیا مطلب ہے؟ وہ کہنے لگا کہ یہ پودا دھوپ میں نہیں اگ سکتا۔ یہ ہمیشہ کسی درخت کے سائے میں اگے گا۔ جب وہ آدمی یہ چیز بتا رہا تھا تو میرے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ انسان بھی اپنے بڑوں کے سامنے شیڈ وٹری بن کر رہتا ہے۔ جیسے اس درخت کو اللہ نے خوش بودار پھل عطا فرما دیا اسی طرح ایسے بندے کو بھی اللہ تعالیٰ خوش بودار اعمال

عطا فرمادے گا۔ہمیں چاہیے کہ ہم ہر لمحے نیکی کا بیج بوتے رہیں۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا جب ہم نیکیوں کا باغ لگا ہوا دیکھیں گے ؎

گل سادی اے میلہ گھڑی دا اے
رتاں آندیاں جاندیاں رہندیاں نیں
کرماں والیاں اوہ جیہڑیاں
رُکھ لا کے مُڑ چھانویں بیہندیاں نیں

جو بندہ درخت لگاتا ہےاور پھراس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کرآرام کرتا ہے وہ بخت والا ہوتا ہے۔ہم بھی آج نیکیوں کے درخت لگائیں اورکل قیامت کے دن کڑکتی دھوپ میں عرش کی چھاؤں میں آرام کے ساتھ بیٹھیں۔

درخت کی مانند بنیے نہ کہ بیل کی مانند:

ایک ہوتا ہے درخت اور ایک ہوتی ہے بیل۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ درخت اگنے میں سالوں لگاتا ہے۔مگراس کے بعد یہ سالوں زندہ بھی رہتا ہے۔کسی درخت کی عمرسوسال اور کسی درخت کی عمرکئی سوسال۔ہمیں کسی ملک میں ایک درخت دیکھنے کا موقع ملا جس کی عمر ایک سوسال ہوچکی تھی اوراس کودیکھنے کے لیے دوسرے ملکوں سے سیاح آرہے تھے۔اس کے اوپر پھول بھی لگے ہوئے تھےاور پھل بھی لگا ہوا تھا۔

ایسے درخت بھی ہیں جن کی عمرکئی سوسال ہوتی ہے۔امریکا کی ریاست کیلیفورنیا میں ایک ایسا درخت ہوتا ہےجس کی عمر سینکڑوں سال ہوتی ہے اوراس کا تنا اتنا بڑا ہوجاتا ہے کہ اس تنے کوکاٹ کراس میں سے بس گزرنے کی سڑک بنائی جاتی ہے۔ وہ اگا ہوادرخت ہے مگرس کوکاٹ کراس کے اندر سے اتنی بڑی سڑک بنادی گئی کہ اس پر سے بس گزرجاتی ہے۔تو درخت اگنے اور بڑھنے میں سالوں لگاتے ہیں اور پھراس کو زندگی بھی سالوں ملتی ہے۔

بیل کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ چند دنوں میں پھیلتی ہے۔ کبھی آپ بیل پرغور کریں کہ بیج لگے تو یوں لگتا ہے کہ وہ دنوں کے اندر ہر چیز کو کور کر لے گی لیکن وہ جتنی جلدی پھیلتی ہے، اتنی ہی جلدی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ آج بالکل ہری بھری نظر آ رہی ہوگی تو کل آپ دیکھیں گے کہ ساری خشک نظر آئے گی۔ یہی کہیں گے کہ جی بیل تھی، ختم ہوگئی۔

درخت نے اپنے تیار ہونے میں سالوں لگائے اور بہار بھی اس کو سالوں ملی اور بیل نے دنوں میں اپنے آپ کو بنایا اور اسے بہار بھی چند دنوں کی ملی۔ آج کل انسان بھی بیل بننا چاہتا ہے۔ محنت نہ کرنی پڑے، مدرسے اور سکول کالج کے طلبا کہتے ہیں کہ پڑھنا نہ پڑے۔ ان کو کام کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ مشقت اٹھانا مصیبت نظر آتی ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ بس محنت کیے بغیر ہم بن جائیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بیل بننا چاہتے ہیں۔ پھر یاد رکھیں کہ ختم بھی بیل کی طرح ہوں گے۔

جڑیں درخت کے بقدر گہری کیوں؟:

درخت کے بارے میں ایک موٹا سا اصول یہ ہے کہ جتنا یہ زمین سے اوپر نظر آتا ہے اتنا ہی یہ زمین سے نیچے ہوتا ہے۔ درخت کی جڑیں زمین میں اتنی گہری ہوتی ہیں جتنا درخت کی اپنی اونچائی ہوتی ہے۔ اور جتنا درخت کا گھیر ہوتا ہے اتنا ہی اس کی جڑوں کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ اس میں بھی ہمارے لیے سبق ہے کہ جو اچھا انسان ہوتا ہے اس کی شخصیت کے اندر گہرائی ہوتی ہے اور جتنا لوگوں کے سامنے وہ اعمال کرتا نظر آتا ہے، جب وہ خلوت میں ہوتا ہے تو اس سے زیادہ اعمال کرتا ہے۔

دن اور رات میں درخت کی بڑھوتری میں سبق:

دن کی روشنی میں درخت کی شاخیں بڑھتی ہیں اور رات کی تاریکی میں درخت کی

جڑیں بڑھتی ہیں۔ انسان کا بھی یہی حال ہے کہ دن کی محنت میں اس کی شاخیں بڑھتی ہیں یعنی لوگوں میں وہ دعوت کا کام کرتا ہے اور جب رات کے آخری پہر میں تہجد کے لیے اٹھتا ہے تو پھر اللہ کے سامنے اس کی جڑیں بڑھتی ہیں۔ آج تہجد میں اٹھنے کی تو ہم کوشش ہی نہیں کرتے اور بے جڑ کے درخت بنے پھرتے ہیں۔ جس درخت کی جڑیں ہی نہ رہیں وہ درخت ہی کیا رہے گا!؟

فرش توڑ کر اگنے والے درخت کا پیغام:

ہمارے ایک دوست نے اپنا ایک گھر بنایا تو گھر میں ایک درخت تھا، اس نے اس درخت کو اوپر سے کاٹ دیا۔ یہ سوچ کر کہ جڑوں کو کھود کر نکالنا تو بہت مشکل ہے۔ اس کے بعد اس نے اس کے اوپر چپس کا فرش ڈال دیا۔

کچھ مہینوں کے بعد اس کو محسوس ہوا کہ اس مکان کا فرش ایک جگہ سے ابھرنا شروع ہوا۔ پھر چند دنوں کے بعد اس نے دیکھا کہ اندر سے اس درخت کی کونپلیں نکلیں۔ فرش کو انہوں نے توڑ دیا اور درخت نے پھر اگنا شروع کر دیا۔ تب اسے کسی نے بتایا کہ یہ درخت کٹنے کے باوجود زندہ تھا۔ اگر یہ مردہ لکڑی ہوتی تو دفن رہتی۔ تم نے اس کے اوپر منوں بوجھ تو ڈال دیا، مگر زندہ درخت نے منوں بوجھ کو ہٹا کر پھر سے اگنا شروع کر دیا۔

اس میں بھی ہمارے لیے سبق ہے کہ کبھی ہمارے اوپر بھی حالات کا منوں بوجھ آ سکتا ہے، حالات مخالف ہو سکتے ہیں۔ حاسدین حسد کر سکتے ہیں، دشمن دشمنی کر سکتے ہیں، مخالفین مخالفت کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اندر سے زندہ ہوں گے تو یہ حالات ہمیں فنا نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ وہ روحانی زندگی انسان کی شخصیت کو بالآخر ان حالات سے نکال دے گی اور اللہ تعالیٰ انسان کو پھر بہار کے دن عطا فرما دیں گے۔ اس لیے مومن

کا دل زندہ ہونا چاہیے۔

گناہ آکاش بیل کی مانند ہیں:

آپ نے آکاش بیل دیکھی ہوگی۔ یہ سبز رنگ کی بیل ہوتی ہے۔ اگر یہ کسی درخت کے اوپر آجائے تو یہ پورے درخت کا گھیراؤ کر لیتی ہے اور اس درخت کو بالکل ختم کر دیتی ہے۔ انسان کے گناہوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ وہ بھی آکاش بیل کی مانند ہیں۔ بعض اوقات انسان کو گناہوں کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ یہ گناہ انسان کو گھیر لیتے ہیں اور اس کی شخصیت کو ختم کر کے رکھ دیتے ہیں۔

جڑوں کی تہجد کے اعمال کے ساتھ مماثلت:

درخت میں ایک تنا ہوتا ہے جس پر شاخیں ہوتی ہیں اور دوسرا اس کی جڑیں بھی ہوتی ہیں۔ انسان کے بارے میں بھی قدرت کے ہاں یہی دستور ہے کہ ہر انسان کی ایک وہ زندگی ہوتی ہے جو لوگوں کے سامنے ہوتی ہے اور ایک وہ زندگی ہوتی ہے جو اللہ کے سامنے ہوتی ہے۔ جتنا روٹ سٹاک زیادہ مضبوط ہوگا اتنا ہی درخت بیماریوں سے بچا رہے گا۔ اسی طرح جتنا انسان کے خلوت کے اور تہجد کے اعمال زیادہ اچھے ہوں گے اتنا ہی انسان اللہ کے سامنے قدآور بنے گا۔

درخت پر سانپ لٹکنے میں سبق:

درخت کے اوپر اگر سانپ بھی لٹکتے رہیں تو اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ مومن کی زندگی بھی ایسی ہی ہونی چاہیے کہ ناموافق ماحول سے اس کو متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ بس وہ اپنے کام میں لگا رہے۔ وہ علم میں، عمل میں، دین کی دعوت میں اور اللہ سے تعلق بڑھانے میں اپنے آپ کو آگے بڑھاتا رہے۔

درخت میں نوجوانوں کے لیے ایک خاص پیغام:

درخت کے اندر یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ماحول سے نیوٹریشن (غذا) لیتا ہے، مثلاً:

- ......زمین سے اس نے معدنیات لیں، پانی لیا۔
- ......ہوا سے اس نے گیس لی۔
- ......روشنی سے اس نے پاور لی۔

اور اس کے بعد نشوونما پائی۔

لیکن درخت فقط لیتا ہی نہیں۔ اگر لیتا ہے تو پھر دیتا بھی ہے۔ غور کریں،

- ......اس کا سایہ دوسروں کے لیے،
- ......اس کا پھل دوسروں کے لیے،
- ......اس کا پھول دوسروں کے لیے، حتیٰ کہ
- ......اگر وہ خشک ہو جائے تو اس کی لکڑی بھی دوسروں کے جلانے کے کام آتی ہے۔

تو درخت نے اگر کچھ لیا تھا تو اس نے دیا بھی۔ ہمیں یہاں سے سبق سیکھنا چاہیے کہ ہم اس دنیا میں زندگی گزارنے کے دوران اپنے گھر میں اپنے بڑوں سے لیتے ہیں۔ مثلاً

- ......ماں سے محبت ملی،
- ......باپ سے شفقت ملی،
- ......بھائی سے تعاون ملا،
- ......بہن سے دعائیں ملیں۔

یہ سب چیزیں ہمیں مل رہی ہیں اور ہم نشوونما پا رہے ہیں۔ تو نشوونما پانے کے بعد ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنا سب کچھ دوسروں کے لیے وقف کریں۔ ہم بھی ایسے بنیں کہ

- ......گھر والوں کے لیے باعث رحمت ہوں،
- ......اللہ والوں کے لیے باعث رحمت ہوں،
- ......اپنے معاشرے کے لیے باعث رحمت بنیں، اور
- ......اچھے اخلاق کے ذریعے ہم دوسروں کو خوشی پہنچائیں۔

لیکن آج کا نوجوان کیا چاہتا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ کھانا بھی اچھا ملے، لباس بھی اچھا ملے اور سواری بھی بہترین ہو۔ اور جب ماں باپ کہتے ہیں کہ پڑھو، تو وہ جواب دیتا ہے کہ پڑھنے کے علاوہ کچھ اور بتائیں۔ جوان کا فرض منصبی ہوتا ہے وہ پورا کرنے کے لیے ان کا دل نہیں چاہتا۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ سب کچھ تو مجھے دیں، مگر مجھے کسی کو کچھ واپس نہیں دینا۔

آج حالت یہ ہے کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو جھڑکی دے دے تو وہ منہ پھلا لیتا ہے اور غصے میں آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ بس میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ انہوں نے ہی اسے پالا پوسا، محبتیں دیں اور پھر یہ اس عمر کو پہنچا۔ لیکن ذرا سی بات پہ ماں سے کہتا ہے کہ میں گھر چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔

اگر کوئی شاخ یہ سوچے کہ میں تو درخت کے ساتھ مقید ہو گئی ہوں، آزاد ہی نہیں ہوں، اس کے ساتھ بندھی ہوئی ہوں، اگر میں درخت سے ہٹ جاؤں گی، کٹ جاؤں گی تو آزاد ہو جاؤں گی، تو یاد رکھیں کہ اگر یہ شاخ درخت سے کٹے گی تو سرسبز نہیں رہے گی، نہ اس پر پھل رہے گا نہ پھول رہیں گے اور جب خشک ہو گی پھر آگ میں ڈالنے کے کام آئے گی۔

جس طرح آج کل کا نوجوان یہ سوچتا ہے کہ میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا، میں تو گھر میں بس بندھا ہوا ہوں، میں الگ ہو جاؤں گا تو آزاد ہو جاؤں گا۔ یہ آزاد کیا ہو گا؟ یہ شیطان قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھ جائے گا اور کل کو جہنم کا ایندھن بن جائے

گا۔ایک آدمی کا بازو اگر یہ کہے کہ میں تو خواہ مخواہ جسم کے ساتھ بندھا ہوا ہوں، میں تو جسم سے الگ ہو کر آزاد ہو جاؤں گا، تو یہ اس بازو کی غلط فہمی ہے۔ یہ اس وقت تک صحت منداور زندہ رہے گا جب تک جسم کے ساتھ رہے گا۔اگر یہ جسم سے کٹے گا تو پھر اس میں بو پڑے گی، پھراس میں کیڑے پڑیں گے اور اس کٹے ہوئے بازو کو پھر کتے ہی چوسیں گے اور پچوڑیں گے۔اسی طرح جو نوجوان اپنے گھر سے دور چلے جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ان کو بھی ماحول معاشرے کے آوارہ لوگ اپنا شکار بنالیا کرتے ہیں۔

اس لیے آج کل کے نوجوان کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اگر ماں باپ ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں تو وہ دشمنی کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے، بلکہ محبت کی بنا پر کرتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کے اندر کمال دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے سمجھاتے ہیں کہ بیٹا! ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے، بلکہ زندگی کی اونچ نیچ کو دیکھا اور تجربات حاصل کیے ہیں۔جن مشکلات سے ہم گزر کر آئے، ہم ان تجربات میں پڑنے کی بجائے کھری کھری باتیں بتاتے ہیں، اگر یہ اصول اپنا لو گے تو تم کامیاب ہو جاؤ گے۔اس لیے اپنے والدین کی، اپنے اساتذہ کی ڈانٹ ڈپٹ کو اپنے لیے باعث رحمت سمجھنا چاہیے اور اپنے بڑوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

کمتر چیز لے کر بہتر واپس لوٹانا:

درخت زمین سے کم تر چیز لیتا ہے اور بہتر چیزیں واپس کرتا ہے۔کم تر چیزوں سے کیا مراد ہے؟ کہ زمین سے اس نے نائٹروجن لی، کیلشیم لی، فاسفورس لی، پانی لیا اور اس قسم کی معدنیات لیں۔اور جب لوٹایا تو کیا لوٹایا؟ پھول لوٹایا، پھل دیے، قیمتی چیزیں واپس دیں۔اچھے انسان کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے ماحول و معاشرے سے جتنی چیزیں لے، وہ اپنی زندگی میں اس سے بہتر چیزیں واپس کرنے کی کوشش کرے۔

خزاں کے موسم میں درختوں کا پیغام:

سردیوں کے موسم میں برفانی علاقوں کے درختوں کو دیکھا کہ ان کے پتے بھی ختم ہو جاتے ہیں، پھل پھول بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ بالکل ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے کسی نے زمین میں لکڑی گاڑ دی ہو۔ ان پر خوب برف گرتی ہے۔ وہ اس برف کے اندر بھی صبر سے کھڑے رہتے ہیں۔ برفانی ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں، مگر وہ ان میں بھی کھمبے کی طرح گڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان درختوں کو پتا ہے کہ اب ماحول مخالف ہے، مگر یہ وقت بھی ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اگر بہار ہمیشہ نہیں رہی تھی تو یہ خزاں کا موسم بھی ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اس لیے مجھے صبر کے ساتھ دو تین مہینے گزارنے ہیں۔ چنانچہ جب وہ دو تین مہینے کا وقت گزار لیتا ہے تو سردیاں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اسی لکڑی نما درخت کے اندر سے کونپلیں نکلتی ہیں، پتے نکلتے ہیں، شاخیں نکلتی ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اس درخت کو پھل اور پھول بھی عطا فرما دیتے ہیں۔

اس سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے کہ بسا اوقات ہمیں بھی مخالفت کے ماحول میں رہنا پڑ جاتا ہے۔ مگر درخت کی طرح ہم بھی صبر و ضبط کے ساتھ وقت گزار دیں۔ اگر صبر سے وقت گزار دیں گے تو غم کی شام بھی ختم ہو جائے گی۔ ع

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

یہ صبر آزما وقت گزر جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ بہار کا وقت عطا فرما دیتے ہیں۔

ہر پھل کی قیمت میں پوشیدہ اسرار:

درخت کا ہر پھل اپنی ایک قیمت رکھتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا ہر فرد اپنی قیمت رکھتا ہے۔ جس طرح ہر اینٹ اپنی قیمت رکھتی ہے۔ جب یہ سب جڑ جاتی ہیں تو

پھر ایک دیوار بن جاتی ہے، اسی طرح معاشرے کا ہر فرد اپنی ایک قیمت رکھتا ہے، جب سب آپس میں دلوں کو جوڑ لیتے ہیں تو پھر یہ برائی کے خلاف ایک سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہیں۔

اس لیے ہم کسی کو کم نظر سے نہ دیکھیں۔ کیا معلوم اللہ کے ہاں وہ انسان زیادہ مقام رکھتا ہو؟ ہمیں کسی کے بارے میں کیا معلوم ہے کہ اس کا کونسا عمل اللہ کو پسند آجائے؟ یہ فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔

کون مقبول ہے، کون مردود ہے، بے خبر کیا خبر تجھ کو کیا کون ہے؟
جب تلیں گے عمل سب کے میزان پر تب کھلے گا کہ کھوٹا کھرا کون ہے

اس لیے ہر بندۂ مومن کو محبت کی نظر سے دیکھیں۔ عزت کی نظر سے دیکھیں۔ نبی علیہ السلام بیت اللہ کا طواف فرما رہے ہیں۔ پھر بیت اللہ پر نظر پڑی تو فرمایا کہ بیت اللہ، شرف اور تعظیم و تکریم کا مقام ہے، مگر

حُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ اَرْجَحُ مِنْ حُرْمَةِ الْكَعْبَةِ

"(اللہ کے ہاں) مومن کا احترام بیت اللہ کے احترام سے بھی زیادہ ہے"

اب ہم بیت اللہ شریف کا تو غلاف پکڑ کر روتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں، اور مومن بندے کا گریبان پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ کیا کبھی ہم نے کسی مومن کا احترام اس لیے کیا ہے کہ

- ...... یہ اللہ پر ایمان لانے والا ہے۔
- ...... یہ اللہ کی توحید کو ماننے والا ہے اور
- ...... یہ رسالت کی تصدیق کرنے والا ہے۔

درخت کے جلنے میں خاموش پیغام:

جس طرح آگ کی ایک چنگاری پورے درخت کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، اسی

طرح ایک برا کلمہ انسان کے منہ سے نکلتا ہے اور جنت کی بجائے جہنم جانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مثلاً

- ......کفریہ بول بول دیتے ہیں۔
- ......اسلام کے خلاف بول پڑتے ہیں۔
- ......ایمان والوں کے خلاف باتیں کر دیتے ہیں۔
- ......سنت کا استخفاف کر لیتے ہیں۔

یوں اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ نے کلماتِ کفر کے بیان میں لکھا ہے کہ اگر دو بندے گفتگو کر رہے ہوں اور ان میں سے ایک یہ کہہ دے کہ بھئی! یہ شریعت کی بات ہے، اور آگے سے دوسرا یہ جواب دے دے کہ ''رکھ پرے شریعت کو'' فَقَد کَفَرَ ۔تو ایسا کلمہ کہنے والا بندہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ ایمان بڑی نازک چیز ہے۔ اس کی حفاظت بھی کرنی پڑتی ہے۔ آج کل تو ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ بہت کھلے انداز سے اپنے منہ سے ایسے کفریہ کلمے نکالتے ہیں، اور ان کو اپنے ایمان کی فکر ہی نہیں ہوتی۔

بارش برسنے سے درخت کی شادابی میں حکمت:

جس طرح بارش برستی ہے تو درخت کو سرسبزی اور شادابی مل جاتی ہے۔ اسی طرح جب انسان کے اوپر علم و عرفان کی بارش برستی ہے تو اس کو روحانی طور پر بہار نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ علما صلحا کی محفلوں میں بیٹھنا اپنے اوپر لازم کر لیں۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

عَلَیکُم بِمَجَالِسَةِ العُلَمَاءِ وَاستِمَاعِ کَلَامِ الحُکَمَاءِ

''تمہارے اوپر ضروری ہے کہ تم علما کی مجالس میں بیٹھو اور اہل دانش کی باتیں سنو۔''

اس لیے کہ جس طرح بارش کے برسنے سے زمین کو زندگی مل جاتی ہے، اسی طرح علم وحکمت کی باتوں کو سننے سے مردہ دلوں کو زندگی مل جاتی ہے۔

پھلوں اور گناہوں کے وزن میں مماثلت:

جس طرح درخت کو اپنے پھل بھاری نظر نہیں آتے اسی طرح انسان کو بھی اپنے گناہ وزنی معلوم نہیں ہوتے۔ دوسرا بندہ چھوٹی سی غلطی کرلے تو بڑی نظر آتی ہے اور خود جتنی بھی بڑی غلطی کرلیں اس کو معمولی سمجھتے ہیں۔

خودرو درخت کی طرح مت بنیے:

ایک خودرو درخت بھی ہوتا ہے۔ وہ درخت خود بخود اگ آتا ہے اسی لیے اسے خودرو درخت کہتے ہیں۔ اسے پانی دینے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اس کی شاخوں کی کاٹ تراش بھی کوئی نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ دیکھنے میں بڑا بے ڈھنگا سا ہوتا ہے اور اس کا پھل بھی پورا نہیں ہوتا۔ اور ایک درخت وہ ہوتا ہے جس کا مالی بھی ہوتا ہے، وہ اس کی پرونگ کرکے اس کو بڑے خوب صورت طریقے سے اوپر بڑھاتا ہے۔ وہ اس کو پانی بھی دیتا ہے، نیوٹریشن (غذا) کا بھی خیال رکھتا ہے۔ ایسا درخت پھل بھی زیادہ دیتا ہے اور دیکھنے میں بھی خوبصورت ہوتا ہے۔

بالکل یہی مثال انسان کی بھی ہے۔ بعض انسان اپنے بڑوں کی تربیت میں ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت دیکھنے میں بھی دیدہ زیب ہوتی ہے اور ان کے اعمال سے اللہ کے بندوں کو راحت ملتی ہے۔ اور کچھ بندے خود رو درخت کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی سمجھانے والا نہیں ہوتا۔ نہ استاد سمجھا سکتا ہے اور نہ ہی ماں باپ سمجھا سکتے ہیں۔ وہ خود ہی بڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے کانٹے دار درخت ہوتا ہے ویسے ہی ان کی بھی شخصیت ہوتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ الجھ پڑتے ہیں اور کبھی اس کے ساتھ

الجھ پڑتے ہیں۔

درخت کے ساتھ ایک مکالمہ:

ہمیں چاہیے کہ ہم نیکی کے اوپر استقامت کے ساتھ جمے رہیں۔حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں سفر پر جارہا تھا۔راستے میں تھک گیا اور ایک درخت کے سائے میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔جب میری آنکھ کھلی تو میں نے درخت سے آواز آتے سنی...... یہ جو اللہ والے ہوتے ہیں، ان کو بعض اوقات اللہ تعالیٰ سمعی یا بصری کشف عطا فرما دیتے ہیں۔وہ عجیب سی آوازیں سنتے ہیں جو ہم نہیں سن پاتے......تو فرماتے ہیں کہ وہ درخت مجھ سے گفتگو کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

يَا سِرِّى كُنْ مِثْلِيْ

''اے سری! تو میرے جیسا ہو جا''

فرماتے ہیں کہ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ درخت مجھے کہہ رہا ہے کہ اے سری! تو میرے جیسا ہو جا۔تو میں نے اس درخت سے مخاطب ہو کر کہا:

كَيْفَ اَكُوْنُ مِثْلُكَ؟

''میں تیرے جیسا کیسے بن سکتا ہوں؟

تو درخت نے جواب میں کہا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَنِىْ بِالْاَحْجَارِ فَارْمُوْهُمْ بِالْاَثْمَارِ

''جو لوگ میری طرف پتھر پھینکتے ہیں میں ان لوگوں کی طرف اپنے پھل لوٹاتا ہوں۔''

تو بھی میرے جیسا ہو جا۔تجھے بھی لوگ پتھر ماریں گے اور تو بھی ان پتھروں کے جواب میں اپنا پھل لوٹا دینا۔ان کے ساتھ حسنِ خلق سے پیش آنا۔فرماتے ہیں کہ میں درخت کا جواب سن کر بڑا حیران ہوا کہ درخت نے کیا عجیب بات کہی! لیکن فوراً

میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اگر یہ درخت اتنا اچھا ہے کہ پتھر مارنے والوں کو بھی اپنا پھل کھلاتا ہے تو پھر اس درخت کو اللہ نے آگ کی غذا کیوں بنایا؟ فرماتے ہیں کہ جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا تو میں نے درخت سے یہ سوال پوچھ۔

فَكَيْفَ مَسِيْرُكَ اِلَى النَّارِ

''اے درخت! پھر یہ بتا کہ اللہ نے تجھے آگ کی غذا کیوں بنادیا؟''

یعنی اگر تم اتنے ہی اچھے تھے تو تم آگ کی غذا کیوں بن گئے؟ کہتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں گویا ٹھنڈی سانس لے کر کہا کہ سری! میرے اندر خوبی بھی بڑی اچھی ہے کہ لوگ مجھے پتھر مارتے ہیں اور میں انہیں پھل دیتا ہوں، لیکن میرے اندر ایک خامی بھی بہت بری ہے جس نے میری تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ پوچھا: کون سی خامی ہے؟ درخت کہنے لگا:

فَاَمْلَيْتُ بِالْهَوَاءِ هٰكَذَا هٰكَذَا

''جدھر کی ہوا چلتی ہے میں ادھر کو ڈول جاتا ہوں۔''

سری! میرے اندر استقامت نہیں ہے، اور یہ بات میرے اللہ کو اتنی ناپسند ہے کہ میری خوبیوں کے باوجود اللہ نے مجھے آگ کی غذا بنا دیا۔

شریعت وسنت پر کاربند رہیے:

عزیز طلبا! شریعت وسنت پر قائم ہو جایئے۔ اپنے آپ کو سنت کے رنگ میں رنگ لیجیے۔ فحاشی، عریانی، گناہ اور ظلمت والے ماحول سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم اگر دین کے احکام پر عمل کر رہے ہیں تو ہمارے اوپر یہ اللہ رب العزت کا بڑا کرم اور احسان ہے۔ طلبا مسئلہ پوچھتے ہیں کہ کیا کریں جی؟ نگاہوں کو بچانا بڑا مشکل ہے۔ بھئی! جب مشکل زیادہ ہے تو اس پر اجر بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا ہمت سے کام لیجیے۔ لوگ جب آج کے دور میں برائی کو نہیں چھوڑ رہے تو ہم پھر اچھائی کیوں

چھوڑیں؟ چنانچہ نیکی، شرافت اور اعلیٰ پر اپنے آپ کو جما دیجیے۔ نفس اور شیطان ہمیں بہکائیں گے، ان کے بہکاوے میں نہیں آنا۔ جب اللہ رب العزت کے ہاں عزت والے بن جائیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی عزتیں عطا فرما دیں گے۔

صندل کی خوشبودار لکڑی کا پیغام:

صندل کا درخت اس کلہاڑے کے منہ کو بھی خوشبودار بنا دیتا ہے جو کلہاڑا اسے کاٹتا ہے۔ گویا اس نے برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دیا۔ ہم بھی ایسے بن جائیں۔ فطرت ہمیں یہ سبق سکھا رہی ہے کہ ہم بھی برائی کے بدلے میں اچھائی کا معاملہ کریں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ اسے اخلاق حمیدہ تو نہیں کہتے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (حم السجدہ:۳۴)

''تم برائی کو اچھائی کے ساتھ دھکیلو''

اچھا! بتائیے! کہ اگر ناپاک کپڑے کو پاک کرنا ہو تو کیا پیشاب کے ساتھ پاک ہو جائے گا؟ جب بھی ناپاک کپڑے کو پاک کرنا چاہیں گے تو ہمیشہ پاک پانی سے پاک ہوگا۔ اسی طرح جب بھی آپ برائی کو ختم کرنا چاہیں گے تو وہ اچھائی سے ختم ہو گی۔ وہ بدلے میں برائی سے کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم اچھے بن جائیں تو اللہ تعالیٰ دوسروں کو بھی اچھا بنا دیں گے۔ ہم وہ کریں جو ہمارے اختیار میں ہے۔ پھر اللہ رب العزت وہ کریں گے جو اس کے اختیار میں ہے۔

پھول کی پتیوں کے مسل جانے میں پیغام:

پھول کی پتیاں اس ہتھیلی کو بھی خوشبودار بنا دیتی ہیں جو ہتھیلی ان پتیوں کو مسل دیا کرتی ہے۔ آپ پھول کی پتیوں کو ہاتھ میں لے کر مسل دیں، وہ آپ کے ہاتھ کو خوشبو

دار بنادیں گی۔تو کیا ہم اس سے بھی گئے گزرے ہیں!؟ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم برائی کے بدلے میں اچھائی دینے کا اصول اپنائیں۔ پھر دیکھیں کہ اللہ رب العزت کی طرف سے ہمیں کتنی رحمتیں ملتی ہیں۔

ایک دوسرے کی قدر کریں:

ہم نے یہ دیکھا ہے کہ لوگ قریب رہ کر ایک دوسرے کی قدر نہیں کرتے۔ میاں بیوی آپس میں اکٹھے رہتے ہیں تو بیوی کو خاوند سے ایک ہزار شکوے ہوتے ہیں اور خاوند کو دیکھو تو اسے بیوی سے ایک لاکھ شکوے ہوتے ہیں۔اور جب وہی الگ الگ ہو جائیں تو بیوی آنسو بہا رہی ہوتی ہے۔ پوچھا جائے کہ کیا ہوا؟ تو کہتی ہے کہ خاوند فوت ہو گیا، بڑا اچھا تھا، میرے بچوں کا باپ تھا، میرے سر کا سایہ تھا، عزت کے ساتھ رہتی تھی، کوئی مجھ پر باتیں تو نہیں کر سکتا تھا۔فوت ہونے کے بعد اس کی اہمیت سامنے آتی ہے۔اور وہ خاوند جو بیوی میں ہزاروں عیب نکالتا تھا، بیوی کے فوت ہونے کے بعد رو رہا ہوتا ہے۔ پوچھا جائے کہ خان صاحب! پریشان کیوں بیٹھے ہیں؟ تو کہتا ہے۔ جی! بیوی فوت ہو گئی ہے، اس نے گھر کو سنبھالا ہوا تھا، گھر آباد کیا ہوا تھا، میں کاروبار میں چلا جاتا تھا تو مجھے گھر کی فکر نہیں ہوتی تھی۔اب سمجھ میں آئی ناں بات۔ بھئی! اللہ کی نعمت کی قدردانی کے لیے نعمت چھن جانے کا انتظار کیوں کرتے ہیں۔ جب نعمت ہاتھ سے نکل جاتی ہے تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک نعمت تھی۔

انگریزوں کے ہاں ایک عادت ہے کہ جب کوئی بندہ مر جاتا ہے تو اس سے اظہار محبت کے لیے قبر پر پھول لے کر آتے ہیں اور میت کی قبر کے ساتھ منوں کے حساب سے پھول اکٹھے کر دیتے ہیں۔اس پر کسی انگریز شاعر نے شعر لکھا:

Why we wait till a person die?

''ہم پھول پیش کرنے کے لیے کسی بندے کے مرنے کا کیوں انتظار کرتے ہیں؟ زندگی میں ہی اسے پھول پیش کر دیتے تو اس کو بھی خوشیاں نصیب ہو جاتیں اور ہمارا بھی دل خوش ہو جاتا۔

پھول کے ساتھ کانٹے ہونے کا شکوہ کیوں؟

پچھلے سال کچھ طلبا روز گارڈن (گلاب کے باغ) میں شاخیں کاٹ رہے تھے۔ایک صاحب جب کاٹنے لگے تو ان کو کانٹا چبھ گیا۔جب کانٹا چبھا تو وہ بڑے خفا ہوئے۔مجھے کہنے لگے: یہ کیا جی؟ جہاں پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے ہوتے ہیں۔میں نے کہا: یہ تمہاری اپنی سمجھ کی بات ہے، اگر یہ بات ہے کہ جہاں پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے ہوتے ہیں تو یہ بھی تو ہے کہ کانٹوں کے ساتھ پھول بھی ہوتے ہیں۔جب میں نے اس سے کہا کہ سوچنے کا یہ انداز بھی ہو سکتا ہے تو پھر ان کو تسلی ہو گئی کہ ہاں، جہاں کانٹے ہوتے ہیں وہاں پھول بھی ہوتے ہیں۔اسی طرح اگر ہم گھروں میں رہتے ہوئے اپنے اندر مثبت سوچ پیدا کر لیں تو گھر کے اندر بھی رحمتوں اور خوشیوں کا ماحول بن جائے گا۔

ایک گراں قدر ملفوظ:

ایک شخص خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''حضرت! فلاں بندہ میرا مخالف ہے۔وہ مجھے بڑا تنگ کرتا ہے اور ہر وقت میرے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے''......اصل میں وہ حضرت سے این او سی (اجازت نامہ) مانگنا چاہتا تھا کہ اگر مجھے اجازت دیں تو پھر میں اس کو ذرا مزہ چکھاؤں گا......وہ کہنے لگا: ''حضرت! وہ مجھے برا بھلا کہتا رہتا ہے۔وہ میرے راستے میں کانٹے بچھاتا رہتا ہے''۔حضرت بھی اس کا اندازِ بیاں سمجھ گئے۔کیوں کہ اللہ والے بڑے سمجھدار ہوتے ہیں۔چنانچہ

حضرت ﷺ نے اس کو ایک بڑا عجیب جواب دیا۔ اس کو سونے کی روشنائی سے لکھنا چاہیے حضرت نے فرمایا:

''اے دوست! اگر کوئی تیرے راستے میں کانٹے بچھائے تو تو اس کے راستے میں کانٹے نہ بچھانا، ورنہ پوری دنیا میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔''

کاش! ہم اس اصول کو اپنا لیتے۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ برائی کر رہا ہو تو ہم اس کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کر کے اس کی برائی کو ختم کرنے کا باعث بن جائیں۔

درخت کے پھلوں میں خوش اخلاقی کا درس:

یاد رکھنا! جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے اچھے اخلاق سے پہچانا جاتا ہے۔ جس درخت کا پھل اچھا ہو، لوگ اسے پسند کرتے ہیں، اسے گھروں میں لگاتے ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، اس کو پانی دیتے ہیں۔ اسی طرح جس انسان کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرما لیتے ہیں۔ اسی لیے ایمان لانے کے بعد سب سے بہترین نعمت جو بندے کو مل سکتی ہے وہ خوش اخلاقی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خوش اخلاقی کی زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم اگر

- ...... بچے ہیں تو، بہترین اولاد بن کر دکھائیں،
- ...... بھائی ہیں، تو بہترین بھائی بن کر دکھائیں،
- ...... خاوند ہیں، تو بہترین خاوند بن کر دکھائیں،
- ...... باپ ہیں، تو بہترین باپ بن کر دکھائیں،
- ...... اگر ملک کے شہری ہیں، تو بہترین شہری بن کر دکھائیں،
- ...... اگر کلمہ پڑھنے والے مومن ہیں، تو امت کا بہترین فرد بن کر دکھائیں،
- ...... اللہ کی نعمتیں کھاتے ہیں، اللہ کو ایک اچھا بندہ بن کر دکھائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیکیوں بھری زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ان طلباء کو دنیا و آخرت کی عزتیں نصیب فرمائے اور انہیں ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ (آمین ثم آمین)

وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنْ

مکتبۃ الفقیر کی کتب ملنے کے مراکز

- معہد الفقیر الاسلامی ٹوبہ روڈ، بائی پاس جھنگ 047-7625454
- دارالمطالعہ، نزد پرانی ٹینکی، حاصل پور 062-2442791
- ادارہ اسلامیات، 190 انارکلی لاہور 7353255
- مکتبہ مجددیہ، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 042-7231492
- مکتبہ سید احمد شہید 10 الکریم مارکیٹ اردو بارزار لاہور 042-7228272
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور 041-7224228
- مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان 061-544965
- مکتبہ بیت العلم بنوری ٹاؤن کراچی 021-2018342
- مکتبۃ الشیخ 445/3 بہادر آباد کراچی 0214935493
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی 021-2213768
- مکتبہ علمیہ، دوکان نمبر 2 اسلامی کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی 021-4918946
- مکتبہ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد مدظلہ العالی مین بازار، سرائے نورنگ PP 09261-350364
- حضرت مولانا قاسم منصور صاحب ٹیپو مارکیٹ، مسجد اسامہ بن زید، اسلام آباد 051-2288261
- جامعۃ الصالحات، محبوب سٹریٹ، ڈھوک مستقیم روڈ، پیرودھائی موڑ، پشاور روڈ، راولپنڈی 051-5462347 ، 03009834893

مکتبۃ الفقیر 223 سنت پورہ فیصل آباد